شمالی افریقہ

تصنیف، جان گنتھر　　ترجمہ: سید عابد علی عابد

شمالی افریقہ کا جغرافیہ، تاریخ، مذہب، ثقافت
تہذیب اور ادب

مراکش، تیونس، لبیا، صحرائے اعظم اور الجزائر
کی جنگِ آزادی

This is an authorized Urdu translation of

MEET NORTH AFRICA by John Gunther. Copyright 1957 by John Gunther, Samuel Epstein, and Beryl Williams Epstein. Published by Harper & Brothers, New York.

(SECOND EDITION)

یہ ہے شمالی افریقہ

مصنّف: جان گنتھر

ترجمہ سید عابد علی عابد

کلاسیک ○ لاہور

ناشر: آغا امیر حسین

کلاسیک: ناشر و تاجر - لاہور

طابع: چودھری علی محمد،

اردو پریس - میکلوڈ روڈ لاہور

پہلی بار ۱۰۰۰ سنہ ۱۹۶۰ء

دوسری بار ۲۰۰۰ سنہ ۱۹۶۳ء

به اشتراک

مؤسسۂ مطبوعاتِ فرنکلین، لاہور ـــــ نیویارک

ترتیب

۱- کچھ جغرافیہ اور کچھ تاریخ
۲- شمالی افریقہ کے لوگوں کے عقائد
۳- شمالی افریقہ کے باشندے
۴- مراکش
۵- مراکش کے شہر اور مناظر
۶- تیونس میں بے چینی اور بحران
۷- الجزائر اور جنگِ آزادی
۸- صحرائے اعظم
۹- لیبیا (ایک نئی قوم جو ترقی کی راہ پہ گامزن ہے)
۱۰- خلاصۂ کلام،

○

سیّد قاسم محمود

کے

نام

کچھ جغرافیہ اور کچھ تاریخ

(۱)

میں ابھی شمالی افریقہ کی سیاحت سے لوٹا ہوں۔ اِس ملک سے متعارف ہونے کا ایسا اچھا موقع شاید آپ کو پھر نہ ملے۔ رومانوں اور داستانوں کی اس دلفریب سرزمین کے باشندے یا تو غیروں کی غلامی کا جوا اُتار چکے ہیں یا اسے اتارنے کی کوشش کر رہے ہیں، جنہیں آزادی مل گئی ہے وہ اپنے اُلجھے ہوئے سیاسی اور اقتصادی مسائل سُلجھا رہے ہیں اور جنھیں اب تک آزادی نصیب نہیں ہوئی ہے انھوں نے حصولِ آزادی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے۔

شمالی افریقہ کے حالات ایسے دلچسپ ہیں کہ ہمارا دل بے اختیار ان کی طرف کھنچتا ہے۔ یہاں کہیں تو نئی دنیا پرانی دنیا کے ساتھ ہم آہنگ دکھائی دیتی ہے اور کہیں زندگی کی نئی اور پرانی قدریں ایک دوسرے سے ٹکر لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں چند گھنٹوں میں دنیا کے اس سب سے بڑے صحرائے پُراسرار کے سینکڑوں میل طے کر لیے۔ میرا جہاز اجاڑ خطوں اور ٹیلوں کے اوپر اڑتا چلا جا رہا تھا، مجھے اونٹوں کی ایک لمبی قطار اُس پرانی شاہراہ پر چلتی ہوئی نظر آ رہی تھی جس پر کبھی کارواں کے کارواں گزرا کرتے تھے کوہسار اطلس کی اونچی اونچی پہاڑیوں کے سلسلے صحرا اور بحیرۂ روم کے ساحل کے درمیان سر اٹھائے کھڑے تھے یہیں جگہ جگہ پن بجلی کے صدر مقامات ہیں اور جدید ترین طریقوں

کے مطابق کان کنی بھی جاری ہے لیکن جو چرواہے بھیڑ بکریوں کو چراتے پھراتے ہیں وہ آج بھی اُسی کلاہ دار جُبّے میں لپیٹے نظر آتے ہیں جو ان کے باپ دادا کا خاص لباس تھا یوں بھی ان کے رہن سہن کا وہی سادہ طریقہ ہے جو صدیوں سے رائج چلا آتا ہے۔

ان پہاڑی علاقوں میں قیامت کی سردی پڑتی ہے وہ لوگ جو یہ فرض کر لیتے ہیں کہ تمام شمالی افریقہ گویا گرمی کا گھر ہے انہیں اس پر تعجب ضرور ہوگا۔ حال ہی کی بات ہے کہ یہاں ایسی سردی پڑی کہ برف نے راستے مسدود کر دیئے۔ متاثرہ دیہات کو ہوائی جہازوں کے ذریعے رسد پہنچائی گئی۔ ان پہاڑیوں کے ساحلی ڈھلوان حصوں کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ سردیوں میں زمین جمی ہوئی کیچڑ بن جاتی ہے یہ درست ہے کہ شمالی افریقہ میں گرمی پڑتی ہے یہاں تک کہ صحرائی علاقوں میں ہفتوں تک روزانہ درجہ حرارت ۱۰۰ سے کہیں زیادہ ہوتا ہے لیکن یہاں بھی غروب آفتاب کے بعد سخت سردی پڑنے لگتی ہے۔

ایک سُرتے سیانے فرانسیسی نے اس کیفیت کی کیا خوب لفظی تصویر کھینچی ہے "یہ ملک خود ٹھنڈا ہے، لیکن دھوپ بڑی کڑی ہے"۔

اس تصنیف میں جس شمالی افریقہ سے آپ کو متعارف کیا جائے گا اس کے چار خطے ہیں۔ مراکش، الجزائر، لیبیا اور تیونس۔

اس فہرست میں دو اور خطوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے یعنی مصر اور ہسپانوی صحرا موخر الذکر سے مراد وہ ساحلی علاقہ ہے جہاں آبادی بہت کم ہے اور جو کم و بیش بے برگ و گیاہ ہے باقی رہا مصر، تو وہ دراصل مشرق وسطیٰ کا جزو ہے جس میں شام، اسرائیل، سعودی عرب، نہر سویز اور بحیرۂ احمر کے پار کے ایشیائی علاقے شامل ہیں۔ مصر کی تاریخ کے تانے بانے شمالی افریقہ کے دوسرے علاقوں کی تاریخ سے الجھے ہوئے ہیں، لیکن مجموعی طور پر

مصر کو افریقہ کے بجائے مشرق وسطیٰ کا جزو تصور کرنا درست ہوگا۔

دوسری طرف مراکش، الجزائر، تیونس اور لیبیا کی تاریخ عموماً یورپ کے واقعات سے متاثر ہوتی رہی ہے۔ یہ علاقے بحیرۂ روم کے اُس پار واقع ہیں اور بحیرۂ دنیائے قدیم کی عظیم ترین گذر گاہوں میں شامل رہا ہے۔ ہزاروں سال تک آباد کار سپاہی اور تاجر اس سمندر کو طے کرتے رہے اور یوں اس بحیرے کے دونوں ساحلوں کے رہنے والے باہم خوب آشنا رہے شمالی افریقہ کی پشت پر جو ریت کا سمندر پڑتا ہے اسے عبور کرنا مشکل ہے اور پانی کے سمندر کو پار کرنا آسان، یہی وجہ ہے کہ صحرا سے نیچے جو علاقے واقع ہیں ان سے شمالی افریقہ نے تعلقات کبھی گہرے نہیں ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ شمالی افریقہ کے بعض شہر اس کے لہلہاتے ہوئے کھیت اور زیتون کے باغ اطالیہ یا ہسپانیہ جیسے ملکوں کے شہروں کھیتوں اور باغوں سے مشابہ دکھائی دیتے ہیں۔

شمالی افریقہ کے پہلے آباد کار غالباً آج سے تین ہزار سال پہلے یورپ سے آئے اُن دنوں ان چار ملکوں کی حدود کا نام ونشان بھی نہ تھا جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یہ آباد کار سیدھے سادے کسان تھے اور بربر کہلاتے تھے۔ ان کا رنگ گورا تھا (بعض بربر تو بہت ہی گورے تھے) اور آنکھیں نیلی۔ آجکل شمالی افریقہ میں جو قومیں آباد ہیں۔ اُن میں تعداد اور اہمیت کے لحاظ سے بربروں کی اولاد ہی کو تفوق حاصل ہے۔

کلمہ بربر کا لاطینی مادہ کلمہ بربری (BARBARI) ہے اسی کلمے سے انگریزی لفظ (BARBARIAN) (وحشی) نکلا ہے بلکہ اماز یغین کہلواتے ہیں کہ بربری زبان میں "مردانِ حر" کو کہتے ہیں (ظاہر ہے کہ) بربر ہمیشہ اس لقب کے مستحق نہیں رہے کہ مختلف قوموں نے مختلف زبانوں میں اُن کی حریت یا آزادی ان سے چھین لی ہے۔ فونیقیہ والوں نے مادہ نوں

نے، وینڈال نے اور عربوں نے تو اِن کے ملک پر ہلّہ بولا ہی تھا، موجودہ زمانہ میں فرانس، ہسپانیہ اور اطالیہ کی یورپی افواج نے بھی انہیں تاخت و تاراج کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہ بیرونی حملہ آور جو بحیرۂ روم کی دنیا کے دوسرے خطوں سے آئے تھے، بربروں سے برسرِ پیکار ہوئے، انہیں بھی خون میں نہلایا اور خود بھی نہائے۔ اس ملک کے وسیع کوہسار اور صحرا پر، کہ رقبے میں اقوام متحدہ امریکہ کے علاقے کے نصف سے زیادہ ہیں، ان حملہ آوروں کے نشانات پا اب تک ثبت ہیں۔

ماضی پر ایک نظر

پہلے حملہ آور، یعنی فونیقیہ والے ۱۲۰۰ ق م۔ میں وارد ہوئے اور اس علاقے میں جو اب تیونس کہلاتا ہے ایک عظیم الشان شہر تعمیر کیا، جسے تاریخ کارتھیج کہہ کر پکارتی ہے اس شہر میں سات لاکھ نفوس آباد تھے اور یہیں بیٹھ کر فونیقیہ والے بحیرہ روم کے تمام علاقوں پر حکومت کرتے تھے۔ کارتھیج کے باشندے بہت اچھے تاجر تھے، پھر یہ کہ شمالی افریقہ کے ساحلی خطوں میں چھوٹے چھوٹے گھونگے پائے جاتے جن سے نہایت قیمتی ارغوانی رنگ بنایا جاتا تھا۔ کارتھیج کے لوگوں کی خوشحالی کا دارومدار انہی دو چیزوں پر تھا یعنی تجارت اور مذکورہ بالا رنگ کی فراوانی۔ کارتھیج میں سات منزلہ مکان دکھائی دیتے تھے اور کارتھیج والے میدانِ جنگ میں ہاتھیوں سے وہی کام لیتے تھے جو آجکل کی فوجیں ٹینکوں سے لیتی ہیں۔ اُن دنوں ہاتھی شمالی افریقہ کے جنگلوں میں کثرت سے پائے جاتے تھے اور اتنی تعداد میں سدھانے کے لئے پکڑے جاتے تھے کہ ایک ایک اصطبل میں لمبے لمبے دانتوں والے تین سو ہاتھی بندھے نظر آتے تھے۔

ہزار سال تک شمالی افریقہ کے بیشتر حصوں میں اور بحیرۂ روم کے مغربی ساحل

پر کارتھیج والوں کا ڈنکا بجتا رہا۔ پھر سمندر کے اس پار شہر روما کا ستارۂ اقبال طلوع ہوا، اور رومیوں نے کہا کہ ہم کارتھیج والوں کو شکست دیکر دم لیں گے ۱۴۱ ق م میں روما اور کارتھیج کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی اور تقریباً سو سال تک جنگوں کا سلسلہ جاری رہا، (یہ لڑائیاں پیونک لڑائیاں کہلاتی ہیں)

آخر روما کی فوجوں نے کارتھیج کو آگ لگا دی اور اسے جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ شہر میں جو آگ بھڑکی تھی وہ دس دن تک برابر بھڑکتی رہی۔ اس وقت شہریوں پر قیامت بیت گئی۔ شہری سہم کر کوٹھوں پر چڑھ جاتے اور پھر وحشت میں اوپر سے چھلانگ لگا دیتے تھے کہ کسی طرح شعلوں سے محفوظ رہیں۔ یہ آگ جب بجھی تو کارتھیج کی عظمت کا چراغ بھی بجھ گیا اور شہر جلے ہوئے ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔

اس کے چھ سو سال تک یہ ملک سلطنتِ روما کے زیرِ نگیں رہا کہ حکومت کے نائب یا گورنر روما سے بھیجے جاتے تھے جنہیں اس ملک کی خوشحالی اور ترقی کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی تھی۔ بلکہ وہ یہاں کے جنگلوں سے شیر اور دوسرے وحشی جانور پکڑتے تھے تاکہ وہ سرکسوں میں دکھائے جا سکیں۔ یا پھر ان رومی گورنروں کا مشغلہ لوٹ کھسوٹ ہوتا تھا اور وہ اس ملک کے کھیتوں سے غلّہ، یہاں سے زیتون کا تیل، شراب اور اون کے جہاز بھر بھر کے روما لے جاتے تھے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ رومیوں نے شمالی افریقہ میں کئی عظیم الشان شہر تعمیر کئے۔ شاہراہیں بنوائیں جو شہروں کو باہم دیگر ملاتی تھیں۔ بڑی بڑی نہروں کے ذریعے پہاڑیوں سے پانی لیکر شہروں میں پہنچایا۔ ان لوگوں کی بنائی ہوئی عمارتیں اور شاہراہیں اتنی مضبوط تھیں کہ شمالی افریقہ میں آج تک اس زمانے کی بہت سی عمارتیں اور شاہراہیں موجود ہیں۔

رومیوں کے بعد (ونڈال) آئے۔ یہ گورے چٹے دیو تھے۔ وسطی یورپ ان کا وطن تھا۔ ۴۲۹ء میں انہوں نے رومیوں کو مار کر نکال دیا اور خود ایک صدی تک شمالی افریقہ پر متصرف رہے۔ انہوں نے نہ عمارتیں بنائیں نہ شاہراہیں بلکہ رومیوں کی تعمیرات سے کام لیا۔ یہ لوگ وحشی تھے اور ان کے بہت کم آثار ہم تک پہنچے ہیں۔ اس کے بعد شمالی افریقہ پر ایک ایسا حملہ ہوا کہ اس ملک کی کایا ہی پلٹ گئی۔ یہ نئے حملہ آور تپتے ہوئے تانبے کیطرح سنولائے ہوئے، طاقتور عرب تھے کہ بحیرۂ احمر کے مشرق سے آئے تھے ان لوگوں نے شمالی افریقہ کیصورت بدل ڈالی۔

ان حملہ آوروں کا سلسلہ عرب کے مشرک قبیلوں سے عبارت تھا (یاد رہے کہ بربر بھی مشرک ہی تھے) کچھ عرصہ کے بعد عرب میں ایک پیغمبر پیدا ہوئے۔ ان کا نام نامی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تھا۔ آپ نے لوگوں کو پیغام حق دیا اور اس کے بعد تو یوں معلوم ہوا کہ چٹکیوں میں عرب کے بکھرے ہوئے قبیلے متحد اور منظم ہو گئے کیونکہ سب حضرت محمدؐ کی قیادت میں اسلام کا بول بالا کرنے کے لئے تیار تھے۔ وہ خدا کا نام لے کر اٹھے اور دنیائے معلوم کو خدا کی وحدانیت کے رشتے میں منسلک کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ سو سال بھی نہ گزرے تھے کہ عربوں نے مصر، شمالی افریقہ اور یورپ کے نصف حصہ کو ایک عالم گیر برادری کے رشتے میں منسلک کر دیا۔

شمالی افریقہ کے باشندے تنومند اور دھن کے پکے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو زیر کرنے میں عربوں نے بڑی زحمتیں اٹھائیں۔ بربر بہت بے جگری سے لڑتے تھے اور یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔ آج بھی شمالی افریقہ کے لوگ اس پراسرار عورت کی داستانیں سناتے ہیں جو کاہنہ کہلاتی تھی اور جس نے کئی لڑائیوں میں اپنے ہموطنوں کی قیادت کے فرائض سر انجام دیئے۔ اسی طرح مشہور سپہ سالار حضرت عقبہ کا ذکر بھی

آتا ہے. جن کے مقابلے میں بربر ہمیشہ کانٹے کی تول لڑائی لڑے۔ داستانوں کی زبان کہتی ہے "زمین پر خون اس طرح بہتا تھا جس طرح سمندر میں لہریں اٹھتی ہیں" شروع شروع میں حضرت عقبہ نے میدان پر میدان مارا۔ ان کا دستور تھا کہ مفتوح حریف کی انگلی یا کان کاٹ لیتے تھے اور کہتے تھے۔ "یہ سبق تمہیں اس لئے دیا گیا ہے کہ عربوں کی جی داری سے ڈرتے رہو" حضرت عقبہ اپنے دستور پر عمل کر کے مزید فتوحات کے لئے کسی اور طرف نکل جاتے تھے اور رومیوں کے طریقے کے برخلاف کسی نائب کو مقرر کئے بغیر یا فوج کو متعین کئے بغیر مفتوحہ ملک سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ بربر موقعے کی تاک میں رہتے تھے۔ اُدھر حضرت عقبہ گئے اُدھر بربروں نے پھر عربوں کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

حضرت عقبہ شمالی افریقہ سے گزر کر اوقیانوس تک جا پہنچے، روائتیں کہتی ہیں کہ وہ جوش شجاعت میں اپنے گھوڑے پر سوار پانی کی لہروں میں اُتر گئے اور سمندر کو برا بھلا کہنے لگے کہ مزید تسخیر کی راہ میں حائل ہو گیا ہے۔ جب حضرت عقبہ لوٹے تو بربر پوری تیاری کر لینے کے بعد (ان کے) منتظر تھے، چنانچہ بار بار اُن سے جھڑپیں ہوئیں آخر کار انہیں دھوکے سے شہید کر دیا گیا۔

اُدھر عرب بھی شمالی افریقہ کی تسخیر پر تُلے بیٹھے تھے۔ اب مصر سے تسخیر کا ریلا مغرب کی طرف بڑھا۔ شمالی افریقہ کے باشندوں نے جب دیکھا کہ حضرت عقبہ کے سپاہی گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہیں تو سہم گئے کہ شتر سوار سپاہی انہوں نے کبھی دیکھے نہ تھے۔ آخر کار ۷۰۰ء میں شمالی افریقہ بھی وسیع عالمگیر برادری کا جزو بن گیا جو عرب خدا کا پیغام عام کرنے کے لئے قائم کر رہے تھے اور یوں شمالی افریقہ

اس نظام حیات کا پیرو کار بن گیا جسے اسلام کہتے ہیں۔

انہی دنوں بربر بھی بڑی کثرت سے مُشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان لوگوں کے لئے نیا مذہب قائم کرنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ ابتدا ہی سے یہ لوگ اپنا مذہب تبدیل کرتے رہے ہیں۔ کبھی کارتھیج اور روم کے دیوی دیوتاؤں کے پجاری بنے اور کبھی ان یہودیوں کے اثر سے ایک خدا پر ایمان لے آئے جو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں آکر شمالی افریقہ میں بس گئے تھے۔ کچھ بربر عیسائی ہو گئے تھے۔ ایک نوعمر بربر جس کا باپ مشرک تھا عیسائی ہو گیا تھا اور اپنی پرہیزگاری کے سبب عیسائیوں کی نظروں میں اتنا محترم بن گیا تھا کہ چاروں کھونٹ عیسائی اس کے تقدس اور عظمت کے معترف ہو گئے اور اُسے ولی آگسٹائن کہنے لگے۔ یہ درست ہے کہ عربوں کے ساتھ اسلامی جنگوں میں کچھ ایسے بربر شامل ہو گئے جن کے دلوں میں اسلامی جذبے کے ساتھ ساتھ مال غنیمت کا لالچ بھی تھا۔ بہرحال جب عربوں نے ہسپانیہ پر حملہ کیا تو بربر بھی ان کے دوش بدوش تھے ہسپانیہ کی ایک جنگ میں ایک بربر نوجوان طارق نامی ایسی جگرداری اور کامیابی سے لڑا کہ اس کے اعزاز میں ہسپانیہ کے ساحلی علاقے میں ایک نہایت ہی محکم چٹان کو اس کے نام پر جبل الطارق کہنے لگے۔ یہی کلمہ انگریزی زبان میں جبرالٹر بن گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مختلف جنگوں میں عرب اور بربر ایک دوسرے کے دوش بدوش لڑتے تھے اور ایسا لڑتے تھے کہ کامیابی ہمیشہ ان کے پاؤں چومتی تھی لیکن کچھ ایسے اسباب بھی موجود تھے؛ جن کی بنا پر وہ ایک دوسرے سے بدظن ہوتے چلے گئے اور بالآخر یہ بات ظاہر ہو کے رہی کہ نہ عرب بربروں کو اچھا جانتے ہیں اور نہ بربر عربوں پر اعتماد کرتے ہیں۔ عربوں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ انہیں غلط فہمی ہوئی تھی

شمالی افریقہ پر ابھی تک وہ صحیح معنوں میں متصرف نہ ہوئے تھے۔ اِن حالات میں جو نائب السلطنت شمالی افریقہ پر حکومت کرنے کے لئے بھیجے جاتے تھے ان کا راستہ بڑا کٹھن تھا۔ مختلف فرائض کی بجاآوری میں انہیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بربر عربی نائب کو محض اس لئے ہلاک کر دیتے کہ وہ غیر قوم سے تعلق رکھتا ہے لیکن واقعات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے بربروں کو اتنی محبت تھی کہ جو عربی گورنر اسلامی فرائض بجا نہیں لاتے تھے انہیں وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے خلاف بغاوت کر دیتے تھے۔ آنحضرت صلعم کے وصال کے بعد حالات نے جو رُخ اختیار کیا اس کا تجزیہ کیا جائے تو بربروں کا رویہ کچھ زیادہ عجیب معلوم نہ ہوگا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خدا کے آخری پیغمبر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے بارے میں کچھ باتیں بیان کی جائیں۔ آپ محض دینی رہنما ہی نہ تھے، بلکہ اسلامی ریاست کے سربراہ اور معاشرتی شیرازہ بندی کے ذمہ دار بھی تھے۔ غزوات میں مسلمان فوجوں کی کمان خود کیا کرتے تھے۔ آپ کے وصال کے بعد جانشینی کے مسئلے پر مسلمانوں میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا اور امت دو جماعتوں میں بٹ گئی۔

ایک جماعت (جو بعد میں اہل سنت کہلائی) کا مؤقف یہ تھا کہ جس طرح قبیلوں کے شیوخ منتخب ہوتے تھے اسی طرح آنحضرت صلعم کے جانشین کا بھی انتخاب کیا جائے۔ دوسری جماعت یہ چاہتی تھی کہ آپ کا جانشین آپؐ ہی کے کنبے کا کوئی فرد ہونا چاہیئے تاکہ اسے صحیح معنوں میں آپ کا جانشین کہا جا سکے۔ یہ لوگ حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے جو آپ کے داماد بھی تھے اور چچازاد بھائی بھی۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد یہ جماعت اس امر کے لئے

کوشاں رہی کہ آنحضرت صلعم کی اولاد ہی ساری دنیا پر حکمرانی کرے۔ یہ جماعت اہل شیعہ سے عبارت تھی (اس تشیعہ کا ماخذ شیعہ ہے) جس کے معنی ہیں۔ جماعت، حامی، حلیف۔

شیعوں اور سُنیوں کے درمیان اختلافات رونما ہو گئے۔ حضرت علی کے زمانے ہی میں اسلامی سلطنت میں انتشار پیدا ہو گیا اور ان کی وفات کے بعد کوئی ایسا راہنما اور قائد نہیں آیا جو دونوں جماعتوں کے منتشر شیرازے کو مجتمع کر دیتا۔ آج بھی ان دو جماعتوں میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں جس طرح پروٹسٹنٹ اور کیتھولک جماعتوں میں۔ اگرچہ دونوں اپنے آپ کو عیسائی کہتی ہیں لیکن عقائد اور افکار میں اختلاف ہے، اسی طرح سنی شیعہ دونوں مسلم کہلاتے ہیں لیکن دونوں کے افکار و عقائد میں اختلاف ہے۔

بربر بھی دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ اس مذہبی اختلافات نے ہیبتناک لڑائیوں کو جنم دیا لیکن اسی اختلاف کی بدولت کبھی کبھی اس ملک کو سربلندی بھی نصیب ہوئی۔ مثال کے طور پر ایک عرب ادریس نامی نے کہ حضرت علیؓ کی اولاد میں سے تھا عباسی خلیفہ کے خلاف بغاوت کی اور پھر بھاگ کر شمالی افریقہ چلا گیا۔ یہاں بہت سے قبیلے اس کے ساتھ ہو گئے اور اس نے مراکش میں اپنی سلطنت قائم کر لی۔

خلیفہ ہارون الرشید، جس کی داستانوں سے الف لیلہ رنگین ہے، آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ افریقہ میں جو مختلف سلطنتیں قائم ہو رہی ہیں ان سب کو شکست دینا بہت مشکل کام ہے۔ چنانچہ اپنی موت سے پہلے (تقریباً ۸۰۰ء) میں وہ شمالی افریقہ کی حکومت سے دست بردار ہو گیا۔ کچھ ممتاز عرب اس ملک میں ضرور باقی رہے لیکن انہیں بربر قبیلوں کی حمایت حاصل تھی۔ ان کے علاوہ سب لوگ راہ فرار اختیار کر کے بغداد جا پہنچے۔

عہدِ زرّیں

اب پہلی بار شمالی افریقہ پر اسی ملک کے باشندوں کی حکومت قائم ہوئی۔ گویا فونیقیہ والوں کے حملے پر دو ہزار سال گزرے تو شمالی افریقہ نے آزادی کا منہ دیکھا۔ جس زمانے میں افریقہ والوں نے اپنے ملک پر خود حکومت کرنی شروع کی وہ اس ملک کی تاریخ کا عہدِ زرّیں کہلاتا ہے۔

جن ایام میں یورپ افلاس اور جہالت میں گرفتار تھا (اور یہ کیفیت صدیوں تک قائم رہی) انہی دنوں شمالی افریقہ میں نئی تہذیب اور ثقافت پروان چڑھ رہی تھی۔ شمالی افریقہ کی خوش حالی اور سربلندی میں سپاہیوں، تاجروں اور عالموں کا حصّہ تھا۔

شمالی افریقہ کے سپاہیوں نے (جنہیں ان کے دشمن سارسینز کہتے تھے) اپنے ملک کی خوب مدافعت کی لیکن ساتھ ہی ظلم توڑنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ان دنوں اگر کوئی فرمانروا یہ دیکھتا تھا کہ سگے بھائیوں اور بیٹوں کی طرف سے اسے مستقبل میں کوئی خدشہ ہے تو انہیں فوراً مروا ڈالتا تھا۔ اوپر کہا جا چکا ہے کہ اس ملک کے سپاہی بہت بہادر تھے چنانچہ پہلے کی طرح وہ ہسپانیہ جا پہنچے، سسلی پر قبضہ کر لیا کہ بحیرۂ روم کا دل ہے اور اطالیہ پر بھی ہلّہ بول دیا۔

تاجر بھی سپاہیوں کی طرح باہمّت تھے۔ وہ کارواں بنا کر مشرق اور جنوب کی طرف ہزاروں میل آگے نکل جاتے تھے۔ عربوں سے انھوں نے اونٹ کی سواری سیکھی تھی۔ تجارت میں بیشتر اونٹوں ہی سے کام لیتے تھے۔ یہ سوداگر صحرا کے اس پار جا پہنچتے تھے اور اُدھر کے ملکوں کی قیمتی چیزیں لے کر واپس آتے تھے۔ یہی سوداگر ان بندرگاہوں تک بھی پہنچتے

تھے جہاں بحر ہند اور بحیرۂ قلزم میں آمد و رفت رکھنے والے جہاز لنگر انداز ہوتے تھے۔ یوں شمالی افریقہ میں ہر قسم کی قیمتی چیزیں پہنچتی تھیں۔ مثلاً گرم مصالحے، ریشم، عطریات سونا، ہیرے جواہرات، ہاتھی دانت، شتر مرغ کی کلغیاں وغیرہ۔

تجارت اور مالِ غنیمت سے شمالی افریقہ کو جو ثروت حاصل ہوئی تھی، اُس میں جزیہ سے اضافہ ہو گیا جو یہودیوں اور عیسائیوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس ملک کی ثروت کا یہ عالم ہو گیا کہ کوئی خواب میں بھی اس کا تصور نہ کر سکتا تھا۔ نئے شہر تعمیر کئے گئے۔ مسجدوں کے گنبدوں کا سونا، دھوپ میں جگ مگ کرتا تھا اور عمارتوں کی خشت ہائے رنگین کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ باغوں میں کمیاب بوٹے لہلہاتے تھے۔ فواروں سے پانی اُبلتا تھا۔ یہ پانی بہت دور سے لایا جاتا تھا اور صحرا کو طے کر کے شہروں میں پہنچتا تھا۔ آج ہم اس ملک کے ماضی کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا کہ وہ سلطنتیں قائم نہ رہیں جو شمالی افریقہ کے بہادروں نے اپنے زورِ بازو سے قائم کی تھیں اور نہ وہ ثروت قائم رہی جس کے ذمہ دار تاجر تھے لیکن اس ملک کے طالب علموں اور عالموں نے جو مختلف درسگاہوں میں پڑھتے اور تعلیم دیتے تھے ایک ایسا خزانہ چھوڑا ہے جس کو کبھی زوال نہیں۔

یہ خزانہ علم ہے۔ اسی خزانۂ علم پر بڑی حد تک عصرِ حاضر کے علوم و فنون اور صنعت و حرفت کی اساس قائم ہے۔

افریقہ کے علمائے نے یونانی فلسفے کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ رومیوں نے بھی یونانی فلسفے سے استفادہ کیا تھا اور ایک نئی ثقافت کی تشکیل میں اس سے کام لیا تھا لیکن بتدریج لوگ اس فلسفے سے ناواقف ہوتے چلے گئے۔ اگر شمالی افریقہ کے عالم اور

مشرق کے عرب ممالک کے فاضل یونانی تالیفات کا ترجمہ نہ کرتے تو آج یورپ کے ممالک غالباً یونانی فلسفے سے آشنا بھی نہ ہوتے۔ شمالی افریقہ اور مشرقی عرب ممالک کے عالموں نے صرف ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے افکار و تصوّرات بھی پیش کئے۔ ساتھ ہی ایران، ہندوستان اور چین کے خزینۂ علم سے بھی فائدہ اٹھایا۔

شمالی افریقہ میں عربی زبان بہت مقبول ہو گئی تھی اس لئے علمی تالیفات میں یہی زبان مستعمل تھی اور بول چال کے لئے بربر اپنی زبان سے کام لیتے تھے اور آج بھی یہی صورت ہے جن علماء کا ذکر کیا گیا ہے انہیں اس بات پر ناز تھا کہ یونانی اور لاطینی تصنیفات عربی میں منتقل کر دی گئیں۔ علاوہ ازیں دوسری عربی بولنے والی قوموں کی طرح انہیں بھی عربی زبان سے جیسے عشق تھا کہ یہ زبان ابلاغ و اظہار کا نہایت لطیف و نفیس وسیلہ ہے۔ اس کا رسم الخط ایسا خوبصورت ہے کہ شمالی افریقہ میں اکثر دیواروں اور دروازوں پر عربی عبارات منقوش نظر آتی ہیں۔ عربی میں طویل نظمیں اور کہانیاں ایسی دلچسپ ملتی ہیں کہ جب کوئی خوش الحان شخص انہیں پڑھ کر سناتا تھا تو سننے والوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے تھے اور آج بھی یہی حالت ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جو مصنف عربی زبان پر شیفتہ تھے انہوں نے اس زبان کو ایسا سنوارا اور نکھارا ہے کہ تمام شمالی افریقہ میں مقبول ہو گئی ہے۔

بدنظمی اور انتشار

افریقہ میں جو نئی حکومتیں قائم ہوئی تھیں وہ طاقتور بھی تھیں اور باثروت بھی۔ لڑائی میں وہ تب ہی الجھتی تھیں کہ جب بحیرۂ روم کے اس پار کے مقبوضات کی مدافعت مقصود ہوتی یا ان میں اضافہ کا ارادہ ہوتا۔ یوں شمالی افریقہ کے اندر لوگ امن و امان اور باہمی محبت سے رہتے تھے۔ باہمی اختلاف کا آغاز مختلف فرقوں کے مذہبی اختلاف سے ہوا تھا۔ مختلف فرقوں

میں رقیبانہ کشمکش پیدا ہو گئی تھی اور ہر فرقہ حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا اور ساتھ ہی مذہبی امور میں اپنا تفوق قائم کرنا چاہتا تھا۔

دسویں صدی میں بربر قبیلوں پر مشتمل ایک جماعت جو اپنے آپ کو بنو فاطمہ کہتی تھی (رسول پاکؐ کی دختر کا نام فاطمۃ الزہراؓ تھا) مصر فتح کرنے کے لیے نکلی مشرق کی اس دور افتادہ سرزمین میں دریائے نیل کے کنارے قاہرہ کا شہر انہی فاطمیوں نے تعمیر کیا۔ جب فاطمی فرمانرواؤں نے قاہرہ کو دارالسلطنت قرار دیا تو اس نے ایک نو عمر بربر کو نائب السلطنت بنا کر شمالی افریقہ بھیجا۔

اس کے بعد لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ وجہ یہ ہوئی کہ شمالی افریقہ کے بربر اور دوسری قومیں فاطمی خلفائے مصر کی اطاعت سے منحرف ہو گئیں۔ بنو فاطمہ نے ان لوگوں سے نمٹنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک جنگجو عربی قبیلے کو تمام شمالی افریقہ ہدیے کے طور پر دے دیا یعنی لڑو اور ملک پر قبضہ کر لو۔ یوں شمالی افریقہ پر عربوں کا دوسرا حملہ شروع ہوا۔ عربی قبیلے مار دھاڑ کرتے آگے بڑھے اور ٹڈی دل کی طرح افریقہ پر چھا گئے۔ یہ عرب حملہ آور خانہ بدوش تھے، جنہیں کاشتکاری اور آب رسانی سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا البتہ وہ تجارت کے رموز سے باخبر تھے چنانچہ ان کی نگرانی میں کاروبار خوب چمکا افریقہ جو مال برآمد کرتا تھا اس کے بدلے میں ملک کو ہر طرح کی قیمتی اشیا ملتی تھیں اور یہ سودا بہت نفع کا تھا

انہی دنوں بحیرۂ روم کے پار یورپ بھی آہستہ آہستہ ظلمت کے دائرے سے نکل رہا تھا۔ جس تحریک کو نشاۃ الثانیہ کہتے تھے۔ اس کو تبھی فروغ حاصل ہوا کہ یورپ کے لوگوں نے عربوں کے خزائن علمی سے فائدہ اٹھایا۔ اب یورپ میں بھی سلطنتیں قائم ہوئیں اور بار ثروت ہوتی چلی گئیں۔ پہلے تو یورپ کے لوگ بڑی خوشی سے افریقہ کے

تاجروں کو ریشم، سونے اور جواہرات کے لیے منہ مانگی قیمت ادا کرتے رہے، لیکن کچھ عرصہ بعد انہیں یہ بات ناگوار گزرنے لگی کہ تجارت کے سررشتے افریقہ والوں کے ہاتھ میں ہوں چنانچہ انہوں نے کوئی نیا بحری راستہ تلاش کرنے کی کوشش شروع کر دی تاکہ ہندوستان چین اور صحرا کے نیچے جو ملک ہیں ان سے براہِ راست تجارتی روابط قائم کیے جا سکیں یوں یورپ کے جہاز رانوں نے عرب علماء کے بنائے ہوئے نقشوں سے کام لے کر بحری سفر کا ایسا راستہ اختیار کیا کہ دنیا کی کایا ہی پلٹ گئی۔

وہ راس امید سے ہوتے ہوئے گھوم کر بحیرۂ ہند میں آن پہنچے۔ کولمبس نے جو ہندوستان تک پہنچنے کا نیا مغربی راستہ تلاش کر رہا تھا، نئی دنیا ہی دریافت کر لی۔ یوں کہنا چاہیئے کہ بات کی بات میں شمالی افریقہ جسے عرب پہلے ہی پامال کر چکے تھے، بالکل بے حیثیت ہو گیا۔ پہلے تو تمام دنیا کی تجارت شمالی افریقہ پر منحصر تھی، لیکن اب تجارت کے نئے راستے کھل جانے کی وجہ سے شمالی افریقہ کی طاقت بھی جاتی رہی اور ثروت بھی۔ اسی پر اقوام بربر کی گردش کے دن ختم نہیں ہو گئے بلکہ ان کا ستارہ برابر گردش میں آتا رہا۔ حتیٰ کہ ۱۴۹۲ء میں انہیں ہسپانیہ سے بھی نکال دیا گیا جہاں صدیوں تک انہوں نے یورپی اقوام پر حکومت کی تھی۔ پھر سسلی کا جزیرہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔

عیسائی حملہ آوروں نے شمالی افریقہ پر ہلہ بول دیا اور سسلی ہی کو اپنا صدر مقام قرار دیا۔ یہ حملہ صلیبی لڑائیوں کے سلسلے کی ایک کڑی تھا کہ ان دنوں عیسائی اپنی دانست میں مشرکوں سے برسرِ پیکار تھے (مسلمانوں کو عیسائی مشرک سمجھتے تھے)۔

اب ناگہاں ترکی نے شمالی افریقہ کو اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا چاہا کہ بحیرۂ روم کے مشرق میں جو علاقے تھے وہ مسخر ہو چکے تھے۔ یورپ ان دنوں اوقیانوس کے اس پار

نئی آبادیاں لبا رہا تھا۔ اس لئے اس طرف متوجہ نہ ہوا۔ خود شمالی افریقہ کی سلطنتیں اتنی کمزور تھیں کہ حملہ آوروں کا مقابلہ نہ کر سکتی تھیں (مراکش سے قطع نظر کہ پہاڑ اس کی حفاظت کرتے ہیں) ترکی کو بڑی جلدی فتح نصیب ہوئی چنانچہ مراکش سے مشرق کی طرف جتنے صوبے تھے وہاں ترکی کے مقرر کردہ نائب السلطنت کہ "بے" کہلاتے تھے جم کر بیٹھ گئے

بحری قزّاق اور امریکہ

یوں شمالی افریقہ اپنی آزادی کھو کے اغیار کے قبضے میں چلا گیا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اقوام بربر ترکوں سے نسبتاً کم نفرت کرتی تھیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ترک مسلمان تھے رسول پاک صلعم کے جانشین کہلاتے تھے اور سلطان کا لقب استعمال کرتے تھے (مراکش کے فرمانروا بھی سلطان کہلاتے تھے اس لئے اس لقب سے بربر خوب آشنا تھے)

اس کے علاوہ ترکی حاکموں نے بربریوں کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ بربری عموماً بحری قزاق تھے، شمالی افریقہ کی اجارہ داری تجارتی معاملات میں ختم ہو گئی تھی اس لئے بحری قزاق لوٹ مار کر کے دولت کمانے کو باعث ننگ نہیں تصور کرتے تھے عیسائیوں کو یہ لوگ اپنا دشمن خیال کرتے تھے اور کسی عیسائی سلطنت کا جہاز کیوں نہ ہو اس پر حملہ کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے ان لوگوں کے لئے قزاقی کا پیشہ حصول معاش کا ذریعہ بھی تھا اور حصولِ ثواب بھی۔

قزاقوں کی جو ٹولیاں بنی تھیں وہ الجزائر کے قزاقوں کو اپنا مرشد تسلیم کرتی تھیں یہی وہ شہر ہے جہاں کے قزاق پرانے وقتوں سے مشہور تھے۔ یہی شہر اس جماعت کا صدر مقام تھا جسے (BAR BAROSSA BROTHERS) کہتے ہیں (اخوان بار بروسہ) ان کی داڑھیاں عموماً سرخ ہوتی تھیں اور ان کے چہرے مُہرے سے خشونت ٹپکتی

تھی۔ ان کے متعلق جو داستانیں بیان کی جاتی ہیں ان کے ہر لفظ سے لہو رستا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

سترھویں صدی کے آغاز میں تیونس اور طرابلس بھی الجزائر کی طرح بحری قزاقوں کی لوٹ مار کے سبب سے خوب خوشحال علاقے بن گئے۔ مراکش کی خود مختار ریاست میں سالی شہر بھی بحری قزاقوں کا اڈہ تھا۔ ان کی بدولت یہ شہر بھی خوشحال اور بارونق ہو گیا۔

قزاق ہر قسم کا مال حاصل کرنے کی جستجو میں رہتے تھے۔ جہاز کے مسافروں کو اور ملازموں کو جو اکثر عیسائی ہوتے تھے قید کر لیتے تھے۔ ان میں سے جو خوب ہٹے کٹے ہوتے تھے ان سے بیگار لی جاتی تھی اور جہاز کا کام مفت کروایا جاتا تھا۔ بچے کھچے مسافروں اور ملاحوں کو نخاس میں پہنچا دیتے تھے، جہاں دور نزدیک کے مالدار سوداگر جمع ہوتے تھے جو سب سے زیادہ بولی دیتا تھا وہی ان انسانوں میں سے کوئی غلام چن لیتا تھا۔

عیسائیوں نے سخت احتجاج کیا کہ عیسائی مرد، عورتیں اور بچے غلام بنائے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں نے احتجاج کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ عیسائی بھی غلاموں کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ عیسائی صرف حبشیوں کو جو صحرا کے جنوب کی طرف رہتے تھے گرفتار کر کے غلاموں کی طرح بیچتے تھے اس کے برخلاف مسلمان ہر جگہ سے غلام پکڑ لاتے تھے۔ مسلمانوں کو وہ عیسائی غلام پسند تھے جن کا رنگ گورا ہوتا تھا۔

آج کہ تمام دنیا میں غلامی عملاً خلاف قانون قرار دی جا چکی ہے۔ ہم پر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ غلام رکھنے والے عیسائیوں کو مسلمانوں کی مخالفت کرنے کا کوئی اخلاقی حق نہ پہنچتا تھا

یورپی اقوام اگر مل جل کر کام کرتیں تو بہت فائدہ ہوتا۔ لیکن ہوا یہ کہ ہر قوم اپنی جان کی خیر مناتی تھی اور اس امید میں مگن رہتی تھی کہ ہمارے جہازوں پر قزاق حملہ نہیں کریں گے۔ انگلستان نے الجزائر اور تیونس کے حکمرانوں کو یہ پیغام بھیجا کہ اگر برطانوی جہازوں

سے تعرض نہ کیا جائے تو انگریز سالی کے سال ان فرمانرواؤں کو خراج کے طور پر بہت بڑی رقم دیں گے ہسپانیہ نے بھی ان فرمانرواؤں سے اپنی شرطوں پر گفت و شنید کی کہ ان کے جہاز بچے رہیں یہی تدبیر دوسری قوموں نے اختیار کیا۔

ترکی کے مقرر کردہ حاکموں نے ان تجاویز کو بہت سراہا ۔ انہوں نے ہر قوم سے خراج حاصل کیا لیکن قزاقی کا سدباب نہ کر سکے چنانچہ کم و بیش پہلے کی سی حالت قائم رہی۔ مشہور تھا کہ قزاقوں کے بدلوں اور مختلف قوموں کے خراج کی رقم کی بدولت الجزائر بے حد خوشحال ملک بن گیا جب امریکی انقلاب کے بعد ریاستہائے امریکہ کا قیام عمل میں آیا تو ان فرمانرواؤں نے اس نئی ریاست سے بھی خراج وصول کیا۔

امریکہ کی حکومت کو طبعاً اس مطالبے سے غصہ بھی آیا اور حیرت بھی ہوئی۔ اس کے باوجود وہ خراج ادا کرتی رہی کہ کمزوری کی بنا پر اور کوئی چارہ کار ہی نہ تھا مثلاً ۱۸۰۰ء میں امریکہ نے الجزائر کے نائب السلطنت کی خدمت میں چاندی کے ڈالروں کے چھ مٹکے بھیجے۔

لیکن ۱۸۰۴ء میں جب طرابلس کے ارباب اختیار نے امریکہ کا جہاز فلاڈلفیا نامی جو ریت پر چڑھ آیا تھا اپنے قبضے میں لے لیا اور ملاحوں کو بندی خانے بھیج دیا تو ایک نوجوان لیفٹیننٹ سٹیفن ڈیکاٹر نامی نے بڑے حوصلے سے کام لیا وہ کچھ نوجوان ساتھ لیکر جہاز کے عرشے پر جا پہنچا۔ منشا یہ تھا کہ جہاز کو بارود سے اڑا دے، اس طرح کہ ساتھ ہی شہر بھی اڑ جائے ایسا تو نہ ہو سکا لیکن اس نوجوان کی دھاک بیٹھ گئی اور یہ بھی احساس ہو گیا کہ امریکا عمر بھر خراج ادا نہیں کریں گے۔ اس کے بعد مسلح امریکی جہاز بڑی بیباکی سے قزاقوں کی بندرگاہوں میں لنگر انداز ہونے لگے اور فرمانرواؤں کو دعوت مبارزت بھی دی۔

ڈیکاٹر نے الجزائر کے فرمانروا کو پیغام بھیجا کہ اب خراج ادا نہیں کیا جائے گا

اس نے مطالبہ کیا کہ امریکی جہازوں سے جو لوگ گرفتار کئے گئے ہیں وہ واپس کئے جائیں اور امریکہ کی بحری تجارت کو جو نقصان پہنچا ہے اس کا ہرجانہ ادا کیا جائے۔ خوش قسمتی سے لفٹیننٹ کی تمام تجویزیں منظور کر لی گئیں۔

تیونس اور طرابلس میں بھی یہی صورت پیدا ہوئی۔ سب کو معلوم ہو گیا کہ جو نئی ریاست امریکہ کے نام سے وجود میں آئی ہے وہ بحری قزاقوں کو مجرم تصور کرتی ہے۔ اور کسی طرح بھی یہ گوارا نہیں کرتی کہ قزاقوں کے مطالبات مان لئے جائیں۔

امریکہ کی بحری تاریخ میں یہ ایک شاندار باب ہے۔ ملاح ایک گیت گاتے ہیں۔ جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ طرابلس کے ساحلوں پر امریکہ کے سپاہیوں نے کیسے حوصلے سے کام لیا۔

یورپی اقوام کی لوٹ کھسوٹ

۱۸۱۵ء تک بحری قزاق اپنی من مانی کرتے رہے لیکن اب وقت آگیا تھا کہ ان کا سدباب کیا جائے۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ امریکی بحری طاقت کی بجائے امریکی انقلاب نے قزاقوں کو تباہ کرنے کے لئے راہ ہموار کر دی۔ اس انقلاب نے امریکہ کو یورپ سے جدا کر دیا چنانچہ یورپی اقوام بحیرہ روم کی طرف متوجہ ہوئیں۔

۱۷۹۸ء میں نپولین اپنا لاؤ لشکر لے کر فاتح کی طرح مصر میں داخل ہوا اور باقاعدہ اس ملک کو فرانسیسی مقبوضات کا جزو قرار دیا۔ ترکی نے کہ مصر پر حکمرانی کا قانونی حق اسی کو حاصل تھا، انگریزوں سے مدد مانگی۔ نپولین کو شکست ہوئی لیکن فرانس کی ملک گیری کی ہوس نہ گئی۔ فرانس نے اعلان کیا کہ اب بحیرہ روم میں کسی کو لوٹ مار کی اجازت نہ دی جائیگی اور قزاقوں کو کچل کر رکھ دیا جائیگا۔

دوسری قوموں نے بھی اسی قسم کا اعلان جاری کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ یورپی اقوام، شمالی افریقہ پر دھاوا بولنے والی ہیں۔

یورپی قومیں شمالی افریقہ پر تسلط قائم کرنے کیلئے جیسے دوڑ پڑیں۔ سب سے زیادہ کامیابی فرانس کو حاصل ہوئی۔ اب فرانس مجبور تھا کہ یا انگلستان سے برسرپیکار ہو جائے یا گفت وشنید کے بعد کوئی سمجھوتا کرلے۔ اسی طرح ترکی، اطالیہ، اور شمالی افریقہ سے بھی فرانس کو نپٹنا تھا۔ چنانچہ اس براعظم کے دوسرے حصوں میں اپنے کچھ مقبوضات سے فرانس کو دستبردار ہونا پڑا۔ اس کے بعد فرانس نے شمالی افریقہ کے بیشتر خطوں کو مطیع بنانا چاہا اور اس وقت تک دم نہ لیا جب تک پورا قبضہ نہ ہو گیا ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں افریقہ کی آزادی کاملاً سلب کرلی گئی۔

۱۸۳۰ء میں فرانس نے الجزائر کے شہر پر قبضہ کرلیا اور جو علاقے اس شہر کے ارد گرد تھے اور الجزائر ہی کہلاتے تھے ان کی ملکیت کا دعویدار بھی ہو گیا۔ صحرا بھی ان علاقوں میں شامل تھا فرانس کی یہ پہلی چال بڑی اچھی تھی کہ اب شمالی افریقہ کے ساحلی علاقے اس کے قبضے میں آگئے اور وہاں مرکزی حکومت قائم کردہ حاکم جم کر بیٹھ گئے۔ اب فرانس نے مشرق کا رخ کیا اور تیونس پر قبضہ کر لیا۔ بہانہ یہ کہ اس ملک کو اطالیہ کے حملوں سے بچایا جائے۔

الجزائر کے مغرب کی طرف مراکش تھا اور فرانس کی تمام مہمات تبھی سودمند ہوتی تھیں کہ اس ملک پر بھی قبضہ کرلیا جاتا۔ اس راہ میں بہت زیادہ مشکلات تھیں لیکن آخر فرانس اور ہسپانیہ نے فیصلہ کیا کہ ہم مل جل کر اس ملک کی "حفاظت" کریں گے لہٰذا یہ ملک دو حصّوں میں بانٹ دیا گیا۔ فرانسیسی مراکش اور ہسپانوی مراکش۔

شمالی افریقہ کا ایک حصہ البتہ فرانس کے ہتھے نہ چڑھا ہسپانوی مراکش سے

قطع نظر) یہ حصہ تیونس اور مصر کے درمیان جو صحرا ہے اس سے عبارت تھا۔ ۱۹۱۲ء تک کم و بیش یہ حصہ ترکی کے زیر نگیں رہا اور تین حصوں میں منقسم (۱) ٹریپولی ٹانیا (۲) فزآن (۳) سارے نیکا۔ ۱۹۱۲ء میں اٹلی نے ان تینوں صوبوں کو فتح کر کے اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا۔ اب یہ تینوں صوبے مل کر لیبیا کہلانے لگے۔

۱۹۱۲ء میں شمالی افریقہ کے چاروں حصے یورپی اقوام کے تصرف میں آ گئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یورپی اقوام کی حکومت قیامت تک قائم رہے گی لیکن ایسا ممکن نہ ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں مراکش، تیونس اور لیبیا آزاد ہو گئے۔ ان ملکوں میں یورپی اقوام کی حکومت صرف چالیس سال تک رہی، الجزائر آج کل بھی فرانس کے مقبوضات کا جزو ہے لیکن یہاں بھی عرصے سے جنگ حریت جاری ہے اور ظاہر ہے یہ ملک ہمیشہ فرانس کا محکوم نہیں رہے گا۔[1]

شمالی افریقہ میں حال ہی میں جو حیرت انگیز انقلاب آیا اور اس ملک نے آزادی حاصل کرنے کی جو کوششیں کی ہیں، یہ دونوں باتیں اتنی اہم اور ڈرامائی ہیں کہ اس ملک کے ہر حصے سے علیحدہ علیحدہ تفصیلی بحث کرنا ہو گی۔ لیکن اس بحث میں الجھنے سے پہلے اُن عوامل و مسائل اور افکار و تصورات کا جائزہ لینا ضروری ہے جو اس سارے علاقے کی اقدار مشترک ہیں اور جن کی بدولت اس ملک میں ہم رنگی پائی جاتی ہے

---

[1] اب الجزائر بھی آزاد ہو گیا ہے۔

(۲)

شمالی افریقہ کے لوگوں کے عقائد

اسلام نے عربوں کو اتنا متاثر کیا تھا کہ وہ اللہ کا نام لے کر تسخیر ممالک کے لئے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ یہ تیرہ سو سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت سے لیکر آج تک یہ مذہب برابر پھلتا پھولتا رہا ہے آج دنیا میں چالیس کروڑ کے قریب مسلمان بستے ہیں۔ شمالی افریقہ کے باشندوں کی اکثریت مسلمان ہے۔ اسی طرح مراکش، الجزائر اور تیونس اور لیبیا میں نوے فیصدی باشندے مسلمان ہیں۔ یہ سب لوگ خدائے واحد پر ایمان رکھتے ہیں اور قرآن مجید کے احکام پر عمل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

رسول پاک صلعم نے عربوں کی کایا ہی پلٹ دی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے متعلق ذرا تفصیل سے بات کی جائے۔ آنحضرت صلعم مکے میں متولد ہوئے۔ سال ولادت ۵۷۰ء ہے۔ آپ قریش کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس قبیلے کا مذہب بھی دوسرے قبیلوں کی طرح بتوں کی پرستش تھا۔ آنحضرت صلعم بچپن میں بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ جب آپ چوبیس برس کے ہوئے تو مکے کی ایک ضعیف اور دولتمند خاتون نے جن کا نام خدیجہ رضؓ تھا اپنا کاروبار آپ کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ حضور اکرمؐ مال تجارت لے کر کارواں میں شامل ہو کے دور دور تک جایا کرتے تھے۔ ان سفروں کے سلسلے میں پہلی بار آپ یہودیوں اور عیسائیوں سے ملے اور ان کے مذہب کے متعلق کوائف حاصل کئے۔ کچھ عرصے کے بعد آپؐ نے حضرت خدیجہ رضؓ

سے نکاح کر لیا۔ آپ کی دیانت داری اور خوش خلقی کی وجہ سے سب لوگ آپ کو معزز اور محترم سمجھتے تھے۔ جہاں کوئی تنازعہ کی صورت پیدا ہوتی تھی، حضورؐ ہی اکثر ثالثی کے لئے منتخب کئے جاتے تھے۔ جاہ و جلال دنیوی کے باوجود اور لوگوں کے احترام کے باوصف آنحضرت کو ایک خلش سی بیقرار رکھتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے شہر سے ذرا دُور فاصلے پر ایک غار میں آنا جانا شروع کر دیا۔ یہیں بیٹھ کر آنحضرت صلعم کشفِ حقیقت کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔

یہیں مراقبے کے عالم میں رسول پاکؐ پر یہ نکتہ روشن ہوا کہ بت پرستی بے ثمر ہے صرف خدائے واحد کی عبادت کرنی چاہیئے۔ عیسائی اور یہودی بھی خدائے واحد پر ایمان لائے تھے، لیکن پھر وہ راہ سے بھٹک گئے تھے اور حضرت ابراہیم کی تعلیمات کو فراموش کر چکے تھے، اب گویا حالات ایسے تھے کہ دنیا کسی مذہبی رہنما کی تلاش میں تھی کہ اخلاقی نامرادیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے گر سب کو بتائے۔

جب رسول پاکؐ نے اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا تو لوگوں نے بہت بُرا مانا۔ بت پرست قبیلے خدائے واحد کی عبادت پر رضامند نہ ہوتے تھے اور اس بات پہ بگڑے ہوئے تھے کہ آنحضرت دیوی دیوتاؤں کو موردِ اعتراض قرار دیتے ہیں۔ تاجروں نے بھی آنحضرتؐ کی مخالفت کی اور ان لوگوں نے بھی جو بت پرستی کے رسوم و آداب کے ذریعے روٹی کماتے تھے۔ اس وقت مکّہ مشرکوں کا گہوارہ تھا یہاں ہزاروں بُت رکھے تھے، دُور دُور سے عرب ہزاروں کی تعداد میں یہاں آتے تھے کچھ لوگوں کا ذریعہ معاش ہی یہ تھا کہ باہر سے آنے والوں کی خدمت کریں، ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا بندوبست کریں، ان کے اونٹوں کو بندھوانے کا

انتقام کریں۔ علاوہ ازیں یہ لوگ باہر سے آنے والے لوگوں کے ہاتھ ایسی چیزیں بھی بیچتے تھے جو نشانی کے طور پر شوق سے گھروں میں رکھی جاتی تھیں۔ مکّہ کے مشرکوں کو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر بت پرستی بند ہو گئی تو باہر سے آنے والوں کی خدمت کرنے والے بھی بے روزگار ہو جائیں گے اور تجارت بھی کم ہو جائے گی۔

آخر کار آنحضرت صلعم نے یہی مناسب سمجھا کہ مکّے سے ہجرت کر جائیں اپنے ساتھیوں کو لیکر مدینہ پہنچے کہ ایک نخلستان کے قریب واقع تھا۔ مسلمانوں کا سن اسی نسبت سے ہجری کہلاتا ہے۔ عین اس طرح جس طرح حضرت عیسیٰ کا ظہور عیسائی تقویم کا آغاز ہے۔

مدینے پہنچ کر مسلمان خوب پھلے پھولے۔ ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ انہوں نے اُس فوج کو مار بھگایا جو مکّے سے اُن پر حملہ کرنے کے لئے آئی تھی آنحضرت کے زمانے میں مدینے کے نواح میں جو مخالف قبیلے رہتے تھے، انہیں بھی زیر کیا گیا۔ ان میں یہودیوں کے قبیلے بھی تھے اور بت پرستوں کے بھی۔ آٹھ سال کے بعد مسلمانوں نے مکّے پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کیں لیکن اب مسلمانوں کی بہادری مسلم تھی، چنانچہ مکّے کے لوگوں نے لڑے بھڑے بغیر شہر رسول پاک کے حوالے کر دیا۔

آنحضرتؐ فاتحانہ شان سے مکّے میں داخل ہوئے اور کعبے میں جو تین سو ساٹھ بت رکھے تھے انہیں توڑ پھوڑ دیا البتہ کعبے کی چار دیواری کو کوئی نقصان نہ پہنچایا مسلمانوں کی نظروں میں کعبہ اس لئے مقدس ہے کہ اسے حضرت ابراہیم نے تعمیر کیا تھا۔ رسول پاک کی نظر میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پیغمبر

تھے اور احترام کے مستحق۔

اس کے بعد "مکہ" بھی مسلمانوں کے لئے ایک مقدس مقام بن گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مکے کے تاجروں کے خدشے باطل نکلے۔ لوگ بے روزگار نہیں ہوئے، کہ سال کے سال ہزاروں مسلمان حج کے لئے آتے تھے۔ آج بھی وہی صورت ہے۔

آنحضرت صلعم نے ۶۷۱ عیسوی میں انتقال فرمایا۔ ان پر جو وحی نازل ہوئی تھی اسے تحریری صورت دی گئی، یہی قرآن مجید ہے۔ مسلمانوں نے رسول پاک کے سینکڑوں اقوال وارشادات کو بھی جمع کیا جو قوانین اور ضوابط کی حیثیت رکھتے تھے انہیں "سُنّہ" کہا جاتا ہے۔ یہی دو چیزیں اسلام کی اساس ٹھہریں۔

اب ہم اس عالمگیر مذہب کا تجزیہ کرتے ہیں جسے اسلام کہا جاتا ہے اسلام کی تعلیم بہت سیدھی سادی اور واضح ہے۔ مسلمانوں کو نہ پادریوں کی ضرورت ہے نہ راہبوں کی نہ کاہنوں کی۔ یعنی خدا اور بندے کے درمیان براہِ راست رابطہ پیدا کر دیا گیا ہے۔ نماز جہاں جی چاہے پڑھی جا سکتی ہے۔ مثلاً کسی کارخانے میں یا کھیت میں، کارواں کے ساتھ سفر کرتے ہوئے اور یا ہوائی جہاز میں سوار ہو کر۔ عام طور پر لوگ گھروں میں نماز پڑھتے ہیں۔ لیکن جمعہ کی نماز پڑھنے کیلئے محلے کے لوگ مسجد میں جمع ہوتے ہیں۔

مسجد عام طور پر مربع یا مستطیل ہوتی ہے، درمیان میں صحن ہوتا ہے صحن میں اکثر رنگین اینٹوں کا فرش ہوتا ہے۔ مسجد کے تینوں طرف دالان ہوتے ہیں جو عموماً محرابوں پر قائم ہوتے ہیں۔ چوتھی سمت جس کا رُخ مکے کی طرف ہوتا ہے، نماز پڑھنے کے لئے مخصوص ہے۔ کہیں کہیں چوتھی سمت کے ساتھ مینار یا بُرج دکھائی دیتے ہیں۔

پانچوں وقت مسجد میں اذان ہوتی ہے۔ یعنی فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاؔ۔ خوش الحان موذّن جس کی آواز دور تک جا سکتی ہے۔ مینار یا برج میں کھڑا ہو کر مسلمانوں کو اپنا فریضہ یاد دلاتا ہے، اگر برج یا مینار نہ ہو تو دروازے میں کھڑے ہو کر اذان دیتا ہے آج کل کہیں کہیں لاؤڈ سپیکر بھی استعمال ہوتا ہے۔

مسلمان مسجد میں داخل ہوتے وقت جوتے اتار دیتے ہیں کہ مقدس مقام کی بے حرمتی نہ ہو۔ مسجد میں داخل ہو کر مسلمان وضو کرتے ہیں۔ وضو کے لئے عام طور پر مسجد کے صحن میں پانی کا حوض ہوتا ہے۔

وضو کرنے کے بعد لوگ مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔ سامنے کی محراب کا رخ کعبہ کی طرف ہوتا ہے، مسجد میں فرش پر غالیچے بچھے ہوتے ہیں، لیکن کرسیاں یا بنچیں نہیں ہوتیں۔ جمعہ کے دن جو امام نماز پڑھاتا ہے وہ احکام شریعت سے خوب آگاہ ہوتا ہے اور ان معاملات میں بصیرت رکھتا ہے۔ موذّن کی طرح اسے بھی عام آدمیوں سے بالاتر نہیں تصور کیا جاتا اگر کبھی مسجد میں امام نہ پہنچ سکے تو ایسی صورت میں نمازی کسی اور کو امام بنا لیتے ہیں۔

امام کعبے کی طرف رخ کر کے نمازیوں سے ذرا آگے کھڑا ہوتا ہے، نماز پڑھنے والے قیام۔ رکوع اور سجود میں اس کی تقلید کرتے ہیں۔ نماز کے بعد امام مختصر سا خطبہ دیتا ہے۔ جس کا موضوع کوئی قومی مسئلہ ہوتا ہے۔

اسلام کے پانچ ارکان

شرع کے مطابق ہر مسلمان کو لازم ہے کہ کہ (۱) خدا کی وحدانیت اور حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لائے (۲) پانچ وقت نماز پڑھے (۳) اپنی

آمدنی کا دسواں حصہ سال کے سال خیرات کرے۔ ایسی خیرات کو اصطلاح میں زکوٰۃ کہتے ہیں یہ بالواسطہ مفلسوں اور بیماروں کو بھی دی جاسکتی ہے اور رفاہِ عامہ کے اداروں کو بھی مثلاً شفاخانے وغیرہ۔ اسی طرح جو فنڈ غریبوں کی امداد کے لیئے کھولا جائے۔ اس فنڈ میں بھی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے عام لوگوں کے لیے کنوئیں کھود دے جائیں کہ پانی عام مل سکے تو اس سلسلہ میں مدد کے طور پر زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ آج کل زکوٰۃ کے معاملے میں یہاں کے مسلمان بے پروا ہیں) (۴) ماہِ رمضان میں کہ عربوں کی زیچ کے مطابق نواں مہینہ ہے روزہ رکھے (۵) اگر استطاعت ہو تو اپنی زندگی میں کم از کم ایک بار حج کرے۔ جو مسلمان حج کر آتا ہے وہ حاجی کہلاتا ہے اور سر پر ایک سبز عمامہ باندھتا ہے کہ لوگ اسے دیکھتے ہی پہچان لیں کہ اسے حج کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔

مسلمان کا ایمان ہے کہ جو مسلمان احکامِ شرعی کی پیروی کریں گے انہیں موت کے بعد جنت نصیب ہوگی۔ جہاں ہرے بھرے باغ ہوں گے، ہر قسم کے پھل ہوں گے اور انسان کا جس چیز کو جی چاہے گا، مہیا ہو جائے گی۔ یہاں شاہ و گدا میں کوئی امتیاز نہ ہوگا۔ تمام مسلمان خوش و خرم رہیں گے، چاہے دنیا میں انہوں نے کتنی ہی سختیاں کیوں نہ جھیلی ہوں۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں جو بات ہوتی ہے، اللہ کی منشا کے مطابق ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اسلامی ممالک میں انشاءاللہ خوب مستعمل ہے، یعنی اگر خدا نے چاہا تو کسی مسلمان سے پوچھئے کہ کل مینہ برسے گا یا نہیں۔ یا یہ سوال کیجئے کہ اس سال فصل کیسی ہوگی۔ عموماً وہ جواب میں انشاءاللہ ہی کہے گا۔

اسلام کی حیرت انگیز مقبولیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام مختلف قوموں اور نسلوں کے درمیان کوئی تمیز روا نہیں رکھتا، یہی وجہ تھی کہ جب مسلمان اپنے دین کی دعوت لے کر اُٹھے تو ان کے سیلاب کو کوئی نہ روک سکا۔ ایشیا کے تمام رہنے والے اور حبشی دونوں مُشرّف بہ اسلام ہو سکتے ہیں۔ اسلام ان میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ نائجیریا میں جہاں سیاہ فام انسان بستے ہیں کم از کم ایک کروڑ مسلمان ہیں (نائجیریا، افریقہ کا جزو ہے)

واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں میں اسلام کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ جمہوریت کی جو صورت اسلام کے پیشِ نظر ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔

مسجدوں میں جو بیٹھنے کی جگہ نہیں ہوتی تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر و غریب میں کوئی فرق نہیں۔ اگر مسجد میں بیٹھنے کے لئے کرسیاں یا بنچیں فراہم کی جاتیں تو ممکن ہے کہ دولت مند اور عالی منصب اشخاص ان پر بیٹھنا اپنا حق سمجھتے مسجد میں بھی مسلمان ایک دوسرے سے یوں ملتے ہیں جیسے بالکل ہم رتبہ ہوں اور ہر مسلمان اپنے آپ کو غیر مسلموں سے بہتر سمجھتا ہے۔

اسلام کی روز افزوں مقبولیت کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ مسلمانوں کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ پرانے قبائلی رسوم و رواج کو برقرار رکھیں بشرطیکہ کوئی بات احکامِ شرعی کے خلاف نہ ہو۔

اکثر لوگوں نے جِنّوں کا ذکر سنا ہوگا۔ الف لیلہ کی ایک مشہور داستان میں الہ دین کو وہ جادو کا چراغ مل جاتا ہے جسے کسی چیز کے ساتھ رگڑنے سے جِنّ نمودار ہوتا ہے۔ ہم لوگ اکثر مغرب کے باشندے ہیں۔ جِنّوں کو افسانوی کردار

تصور کرتے ہیں لیکن بہت سے مسلمان ایسے ہیں جن کے خیال میں جنوں کا وجود ہے اور زندگی میں انہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ شمالی افریقہ میں مرابطین یا بزرگانِ دین کا بہت اثر ہے۔ مسلمان ان کا اس لئے احترام کرتے ہیں کہ وہ نیکوکار اور راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ اِن مسلمانوں کے خیال میں یہ بزرگانِ دین کشف و کرامات کی قوت رکھتے ہیں اور مستقبل کے متعلق پیش گوئیاں کر سکتے ہیں۔

مرابطین کے پاس جانا یا انہیں چھو لینا سعادت تصور کیا جاتا ہے۔ مرنے کے بعد ان کے گھروں اور مرقدوں کو مقدس خیال کیا جاتا ہے اور لوگ جوق در جوق وہاں جاکر دعائیں مانگتے ہیں۔ شمالی افریقہ میں ایسے مقامات سینکڑوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

آنحضرت کی فراست

قرآن پاک اور احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ حضرت محمدؐ صلعم کی سوجھ بوجھ بڑی اچھی تھی۔ جب شراب کو حرام کر دیا گیا تو رسول اللہ صلعم نے بڑی سختی سے مسلمانوں کو شراب پینے سے روکا یہاں تک کہ مسلمان اس چیز سے متنفر ہو گئے۔ آج شمالی افریقہ میں کوکا کولا اور شربت جو بہت مقبول ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ شراب پینا سخت منع ہے۔ سور کا گوشت کھانا بھی رسول پاکؐ نے مسلمانوں کے لئے ممنوع قرار دیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ گرم ممالک میں وہ جلدی سڑ جاتا ہے۔

شاید ایک رمز یہ بھی ہو کہ لوگ بھیڑ بکریاں پالا کریں۔ یہ جانور اس گھاس پھونس پر بھی زندہ رہ سکتے ہیں جو کہیں کہیں صحرا میں پایا جاتا ہے پھر ان سے دودھ، اون

اور گوشت تینوں چیزیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

عورتوں کے حقوق اور شادی، بیاہ کے رسوم و رواج میں پہلے کی طرح آج بھی اسلامی دنیا میں، عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں فروتر سمجھا جاتا ہے لیکن اس معاملے میں مذہب کا کوئی قصور نہیں۔ اسلام نے عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیئے ہیں اور دونوں کو ہم رتبہ قرار دیا ہے۔

قرآن پاک نے عورتوں کے حقوق کی صراحت کی ہے اور ان کی حالت کو سدھارنا چاہا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب لڑکیوں سے غلاموں کا سا سلوک کرتے تھے اور بعض تو انتہائی بے رحمی سے انہیں زندہ گاڑ دیتے تھے۔ اسلام نے لڑکیوں کی ہلاکت ممنوع قرار دی اور عورتوں کے حقوق متعیّن کر دیئے۔

عورتوں کو بھی مردوں کی طرح اپنی دولت اور آمدنی پر متصرف ہونے کی اجازت دی گئی علاوہ ازیں انہیں درس و تدریس میں اور تالیف و تصنیف کا اختیار بخشا گیا، یہاں تک کہ عورتوں کو تجارت کرنے کا حق بھی عطا کیا گیا۔

قرآن پاک کی تعلیمات کے مطابق مرد بیک وقت چار بیویاں رکھ سکتا ہے اس بات کا اکثر دنیا کو علم ہے، یہی وجہ ہے کہ تعدّدِ ازدواج کو خاص طور پر مسلمانوں سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ بات غلط ہے۔ رسول پاکؐ کے ظہور سے پہلے بھی عرب اور بعض دوسری قومیں تعدادِ ازدواج کو جائز خیال کرتی تھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ دنیا کے ان خطوں میں جہاں مسلمان نہیں پہنچے، تعدّدِ ازدواج رائج تھی اور ہے۔ یہ بات غالباً سب کو معلوم ہو گی کہ امریکہ میں بھی مارمنز (ایک مذہبی فرقہ) تعدّدِ ازدواج کو جائز سمجھتے تھے اور یہ زیادہ دنوں کی بات نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ رسول پاکؐ کی بعثت سے پہلے عربوں کے ہاں چار سے بھی زیادہ بیویاں ہوا کرتی تھیں۔ جب قرآن مجید میں تعددِ ازدواج کی شرائط بہ صراحت بیان کی گئیں تو عربوں کو احکام قرآنی کی سخت گیری ناگوار گزری۔ اسلام اس بات پر مُصر تھا اور ہے کہ بیویوں سے یکساں سلوک کیا جائے۔ بالفاظ دیگر اگر ایک کو رہنے کے لئے مکان دیا ہے، نوکر چاکر دیئے ہیں تو دوسری بیویوں کو بھی یہی چیزیں ملنی چاہئیں۔

یہ ضرور ہے کہ اسلام نے شادی بیاہ کے متعلق بڑے سیدھے سادے قوانین نافذ کئے مثلاً مردوں کو حق دیا گیا کہ بیوی کو طلاق دے دیں اور یوں یکے بعد دیگرے کئی عورتوں سے شادی کر سکیں۔ طلاق کے لئے یہی کافی تھا کہ مرد قاضی کے سامنے پیش ہو اور تین بار یہ فقرے دُہرائے "میں نے تجھے طلاق دی" ظاہر ہے کہ در حقیقت عورت مخاطب تھی، قاضی نہیں۔

آج کل شمالی افریقہ میں عورتوں کا مقام معرض تغیر میں ہے کہیں تغیر کی رفتار سست ہے کہیں تیز۔ تعددِ ازدواج کا طریقہ غیر مقبول ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کھیتی باڑی کرنے والے مرد تین چار عورتوں کو بیک وقت بیوی بنا کر رکھ سکتے ہیں کہ کام کاج میں ہاتھ بٹائیں گی۔ لیکن شہروں میں بسنا اور بیک وقت ایک سے زائد بیویاں رکھنا عملاً ناممکن ہوتا چلا جا رہا ہے کہ شہری بیویوں پر بہت صرف کرنا پڑتا ہے۔ اب مسلمانوں کی خاصی تعداد شہروں میں بس گئی ہے اور اب یہ لوگ ایک ہی بیوی پر قانع رہتے ہیں۔ آج کل شمالی افریقہ میں لڑکیوں کو تعلیم بھی دی جا رہی ہے اگرچہ ابھی تک لڑکیوں کی تعداد مدرسوں میں بہت کم پڑھتی ہے مراکش میں پڑھنے والے لڑکوں کی تعداد لڑکیوں سے پانچ سو گنا زیادہ ہے۔

اس کے باوجود کچھ عورتوں کی تعلیم و تربیت اِن خطوط پر کی گئی ہے کہ موجودہ زندگی کے تقاضوں سے آگاہ ہوجائیں۔ ایسی عورتیں گھر سے نکل کر بیرونی دنیا کی سیر کرنا چاہتی ہیں۔ کچھ ایسی بھی ہیں کہ کبھی کبھی سینما بھی چلی جاتی ہیں جہاں امریکہ میں تیار کی ہوئی فلمیں دکھائی جاتی ہیں (بعض اسلامی ممالک میں عورتوں کا سینما جانا بالکل ممنوع ہے) آج کل مسلمان عورتیں خاص طور پر وہ عورتیں جو پڑھ لکھ گئی ہیں یہ پسند نہیں کرتیں کہ ان پر سوکن آئے۔ وہ چاہتی ہیں کہ شوہر صرف انہی کا ہو۔ شاید ان عورتوں کے دلوں میں یہ تمنا بھی سلگ رہی ہو کہ جس شخص سے شادی کرنا مطلوب ہے اس سے میل ملاپ کا موقع بھی ملنا چاہیئے! (شاید شمالی افریقہ میں اس طرح سوچنا بڑی جرائت کا کام ہے) پہلے یہ طریقہ تھا کہ عموماً ماں باپ جہاں چاہتے تھے لڑکیوں کو بیاہ دیتے تھے اور ان سے مشورہ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے تھے۔ کسی مسلمان عورت کو اپنے ہونے والے شوہر کا چہرہ شادی ہوچکنے کے بعد ہی نظر آتا۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی آزاد خیال عورتیں ابھی بہت کم ہیں اور جو ہیں انہیں بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ والدین اولاد کی بات مان بھی لیں تو اور لوگ پیچھا نہیں چھوڑتے، یہاں تک کہ اچھے خاندانوں کے نوجوان بھی غالباً تعلیم یافتہ عورتوں سے ڈرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شادی سے پہلے ہونے والے میاں بیوی کو ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت ملی بھی تو ایک مدت کے بعد ملے گی تاہم عورتوں نے یہ اجازت حاصل کرنے کے لئے اقدامات شروع کردیئے ہیں۔ ابھی تک انہیں بہت کم کامیابی ہوئی ہے کہ پرانے رسم و رواج

کا زور قائم ہے۔

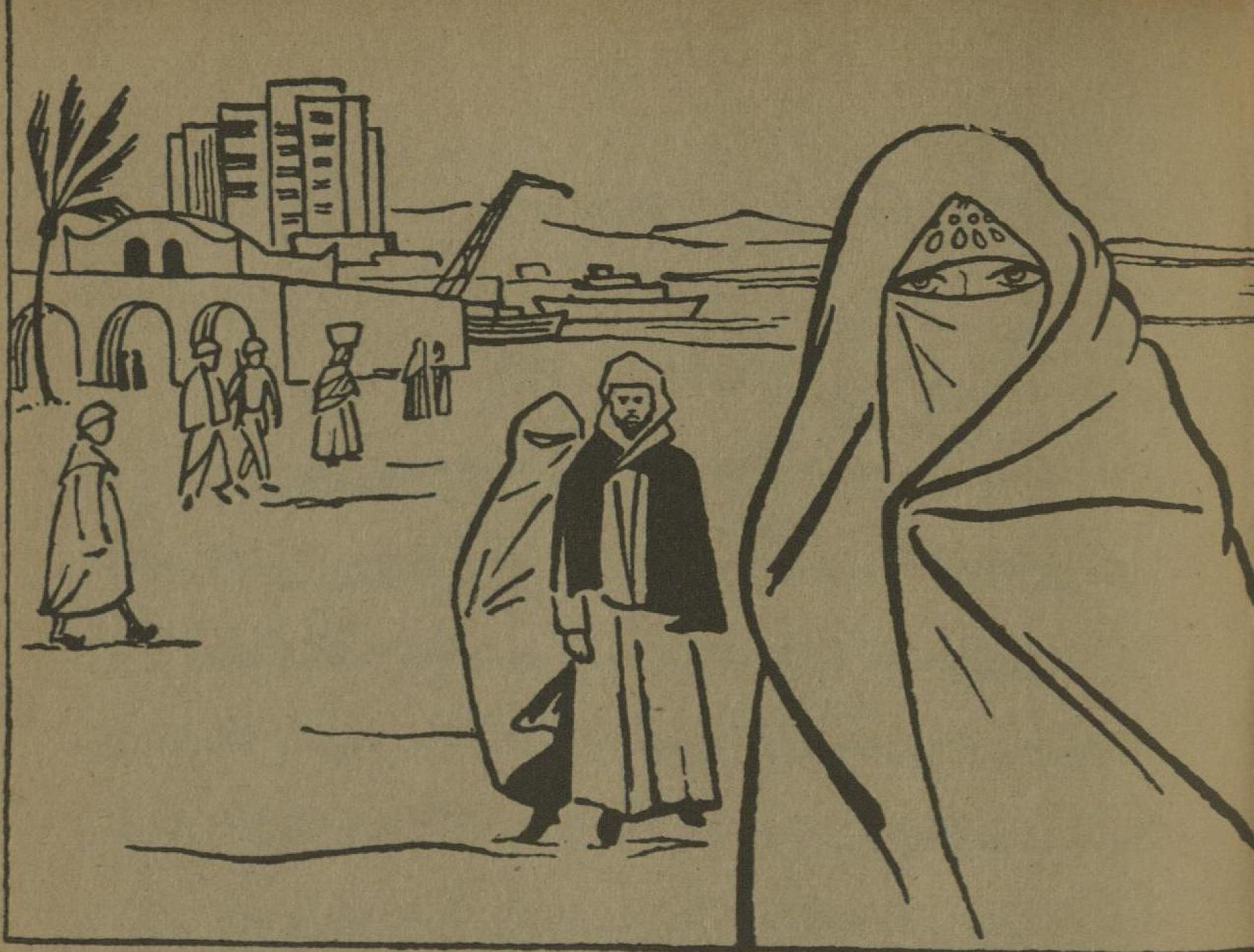
کچھ دنوں کی بات ہے میں اپنے راستے چلا جا رہا تھا کہ مراکش کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں مجھے ایک بارات نظر آئی۔ صورت حال یہ تھی کہ میں پیلے پیلے پہاڑوں کی گھاٹی سے گزر رہا تھا اور ان مسجدوں کو دیکھ کر لطف اٹھا رہا تھا جن کے مختلف رنگ نگاہوں میں گھر کر رہے تھے کہ میرے کان میں سازوں کی آوازیں آئیں معلوم ہوتا تھا کہ ہزاروں ساز نواز ڈھول اور شہنائی بجا رہے ہیں۔

جب یہ جلوس میرے سامنے سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ طبل بہت معمولی قسم کا ہے اور ڈھولک سے مشابہ ہے۔ ساز نوازوں کے پیچھے پیچھے دلہن کے قبیلے کے باریش اکابر چلے آ رہے تھے۔ ایک عورت نے جو سرخ اور سفید دھاریوں والا لباس پہنے تھی لمبی لمبی سبز اور پیلی قندیلیں ہاتھوں میں تھام رکھی تھیں۔ یہ لوگ گزر گئے تو پھر ساز نواز آئے اور اس کے بعد آٹھ نوجوانوں کا ایک گروہ کہ ہانپتا کانپتا چلا آ رہا ہے۔ انہوں نے لمبے لمبے ڈنڈوں پر ایک صندوق سا اٹھایا تھا جو بظاہر کاغذ کا معلوم ہوتا تھا۔ اس صندوق کی صورت انگریزی ٹوپی یا چھوٹے خیمے کی طرح تھی۔ نچلا حصّہ مُربع اور اوپر کا نوک دار۔ اگرچہ یہ صندوق بڑا نہیں تھا لیکن بوجھل ضرور تھا یہ آٹھوں نوجوان اس کے بوجھ تلے دوہرے ہوئے جا رہے تھے۔ رنگین ریشم کی چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں لہراتے ہوئے یہ نوجوان میرے سامنے سے گزر گئے۔ صندوق کے اندر دلہن تھی۔ میں نے اندازہ کیا کہ غالباً وہ خوب موٹی تازی ہوگی کہ بیاہ سے پہلے عورتوں کو خوب کھلاتے پلاتے ہیں۔ شمالی افریقہ میں موٹاپا ایک فیشن سمجھا جاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ دلہن کی آنکھیں بڑی تھیں یا نہیں

اس کی ناک چھوٹی تھی یا کیا اور دہانہ تنگ تھا یا نہیں ، یہ چیزیں کسی عورت میں پائی جائیں تو وہ خوبصورت گنی جاتی ہے۔

جو کچھ میں نے دیکھا اس سے زیادہ کوئی اور شخص بھی نہیں دیکھ سکتا۔ دلہن کو دولہا کے گھر لئے جا رہے تھے، جہاں اسے پہلی بار اپنے شوہر سے ملنا تھا۔ میاں بیوی کے بزرگوں نے اپنی منشا کے مطابق شادی طے کر دی تھی اور طرفین کی مرضی سے مہر طے کیا گیا تھا۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ دولہا اور دلہن پہلی رات مل کے کھانا کھائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ پھر مرتے دم تک انہیں مل کر کھانا کھانا نصیب نہ ہو۔ شب عروسی کے بعد دلہن گھرانے کی عورتوں کے ساتھ کھانا کھاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے خاوند کے گھر سے مر کر ہی نکلے دلہن کی ماں البتہ سال میں ایک بار بیٹی سے ملنے کے لئے آتی ہے۔ اسی طرح سال میں ایک دو بار دلہن کو بھی اپنی سگی یا رشتے کی بہنوں سے ملنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ ان باتوں سے قطع نظر بیوی میاں کی ملازم ہے وہ دائماً حرم میں یا کسی اور محفوظ مقام میں رہتی ہے اور شدید قسم کا پردہ کرتی ہے۔ اگر دلہن کے لڑکے ہوں تو گھرانا پھول کی طرح کھل جاتا ہے۔ لڑکیاں ہوں تو صفِ ماتم بچھ جاتی ہے کہ شمالی افریقہ میں عموماً آج تک ہر طرح مردوں کو ہی تفوق حاصل ہے۔



(۳)

شمالی افریقہ کے باشندے

پرانا عربی مقولہ ہے کہ بربر سچا مسلمان نہیں ہوتا۔ ہاں اس کا خیال ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ یہ واقعہ ہے کہ عربوں کے پیمانے سے ناپا جائے تو بربر راسخ العقیدہ مسلمان ثابت نہ ہوں گے کہ ان میں سے اکثر سور کا گوشت کھاتے ہیں حالانکہ قرآن مجید نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ اس حقیقت سے اس مقولے کا سراغ بھی ملتا ہے کہ شمالی افریقہ میں جو دو مختلف قومیں عرب اور بربر آباد ہیں ان میں کیسے شدید اختلافات کی خلیج حائل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عرب اور بربر ایک دوسرے کے خاندانوں میں شادی کر لیتے ہیں۔ لیکن شاذ و نادر۔ عموماً یہ دونوں قومیں جداگانہ زندگی بسر کرتی ہیں اور ایک دوسرے کو ناپسند کرتی ہیں۔ عربوں کی طبیعت کا رجحان یہ ہے کہ صحرا میں خانہ بدوشوں کی طرح گھومتے پھریں یا شہروں میں کام کاج کریں۔ اس کے برخلاف بربر یہ چاہتے ہیں کہ پہاڑی علاقوں میں کاشت کاری کریں۔ عرب بیشتر اقوام بربر کے مقابلے میں سنولائے ہوئے سے نظر آتے ہیں۔ سانولے سے رنگ کے بربر بھی پائے جاتے ہیں کہ پرانے زمانے میں ان کے آبا و اجداد نے حبشیوں سے شادی بیاہ کے رواج قائم کر لئے تھے۔ آج کل لیبیا کی آبادی کا نصف حصہ اقوام بربر پر مشتمل ہے۔ مراکش میں بھی یہی حالت ہے۔ الجزائر میں بربر کم ہیں یعنی آبادی کا

تیسرا حصہ۔ ان لوگوں کی اکثریت صدیوں کے رواج کے مطابق آج بھی کاشتکاری سے پیٹ پالتی ہے۔ ان کے گھر چھوٹے چھوٹے اور کچی اینٹوں کے ہوتے ہیں۔ ساز و سامان کا نشان بھی نہیں ہوتا۔ ہر کام زمین پر بیٹھ کر کرتے ہیں۔ مثلاً کھانا پینا باتیں کرنا۔ کرسیوں اور میزوں کی انہیں ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ بربر اپنے قبیلے کے وفادار ہوتے ہیں۔ اگر کسی بربر سے پوچھے کہ تم کون ہو تو وہ یہ نہیں کہتا کہ میں مراکش کا رہنے والا ہوں بلکہ بڑے فخر سے یہ جواب دیتا ہے کہ فلاں قبیلے کا فرد ہوں۔ ان کا سردار جو پاشا یا قائد کہلاتا ہے گویا ان لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا ہے کہ بربر اس کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں (قائد کی شمالی افریقہ میں وہی حیثیت ہے جو دیہات میں متعین کسی مجسٹریٹ کی ہو یا شیخ قبیلہ کی ہو۔ پاشا صوبے کا حاکم ہوتا ہے یا شہری نظم و نسق کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اس لئے ممکن ہے کہ وہ کئی قبیلوں کا سردار ہو۔)

جب فرانس نے مراکش پر قبضہ کر لیا تو شروع میں بربر فرانسیسی سپاہیوں کے دوش بدوش ان کے حلیف بن کر لڑے کہ اپنے پاشاؤں سے ان کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ انہوں نے اپنے ہم قوموں کا بھی مقابلہ کیا جو فرانسیسی حملہ آوروں کو شکست دینا چاہتے تھے۔

انخوام بربر کی سپاہیانہ شان دیدنی ہوتی ہے۔ پرانی وضع کی بندوقیں ہوا میں لہراتے ہوئے وہ ایسی بے جگری اور جی داری سے لڑتے ہیں کہ باید و شاید انہیں لڑائی میں لطف آتا ہے (موجودہ عربوں کی یہ کیفیت نہیں) عربوں کی تو یہ حالت ہے کہ خون بہتا دیکھیں تو مضطرب ہو جاتے ہیں پھر وہ ہاتھا پائی

کی لڑائی بھی پسند نہیں کرتے۔ ضرورت آن پڑے تو خنجر استعمال کرتے ہیں۔ ان کی نزاکت طبع کا یہ عالم ہے کہ کوئی طاقتور شخص ملتے وقت ان کا ہاتھ ذرا زور سے دبائے تو پیچھے ہٹ جاتے ہیں کہ ان کی نازک انگلیوں کو تکلیف نہ ہو۔ ان کے مقابلے میں بربر بہت باہمت ہوتے ہیں اور جمالی لمس انہیں پریشان نہیں کر سکتا۔ فرانسیسی جو عربوں کی اکثریت کی تنقیص کرتے ہیں اقوام بربر کے متعلق بہ سبیل مدح حیرانی کے لہجے میں کہتے ہیں "مرد تو بربر ہیں"۔

اکثر تواریخ سے قطع نظر کر لیجیے جو صحرا میں رہتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ بربر لکھنے پڑھنے سے ناآشنا ہیں۔ ان کی زبان میں کوئی تحریر سرے سے موجود ہی نہیں نہ ان کا ادب، نہ اخبار، نہ نصاب کی کتابیں۔ گنتی کے کچھ لوگ عربی بول لیتے ہیں۔ جو لوگ عربی نہیں بول سکتے انہیں شاید عمر بھر یہ معلوم نہ ہو کہ ان شہروں میں کیا واقعات رونما ہو رہے ہیں جو شمالی افریقہ میں ایک نئے انقلاب کی بشارت دیتے ہیں

یہی وجہ ہے کہ عرب اقوامِ بربر کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں کہ یہ اقوام بربر پسماندہ ہیں اور تعلیم سے محروم ہیں اس لئے انہیں ان قوموں کی جدوجہد میں شریک ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں جو ترقی کی راہ پر گامزن ہیں

عرب

کچھ عرب آج تک صحرا میں زندگی بسر کرتے ہیں اور کوہسار اطلس کے جنوب میں۔ جو بے آب و گیاہ علاقے ہیں ان میں خانہ بدوشوں کی طرح گھومتے پھرتے ہیں لیکن یہ بھی یاد رہے کہ شمالی افریقہ کے اکثر شہروں میں اکثریت عربوں ہی کی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ سال کے سال اور عرب شہروں میں بسنے کے لئے اپنے ہم قوموں سے آن ملتے ہیں۔

مجموعی حیثیت سے عرب اقوام سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں اور آزاد خیال بھی۔ عربوں ہی نے ان سیاسی تحریکات میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا جن کا مقصد یہ تھا کہ فرانس کے پنجے سے گلو خلاصی حاصل کی جائے۔ انہی عربوں کے تعاون کی بدولت فرانس کو شکست اور شمالی افریقہ کو آزادی نصیب ہوئی۔ اب جو خود مختار ریاستیں وجود میں آئی ہیں اور جن پر شمالی افریقہ کے باشندے خود حکومت کرتے ہیں ان کی کلیدی آسامیوں پر عرب ہی فائز ہیں۔ عربوں کی خاصی تعداد کو قوم پرست کا لقب ہی دیا جا سکتا ہے مثال کے طور پر تیونس کے عرب باشندے آپکو تیونسی لکھتے ہیں

آج کل کے عرب تعلیم حاصل کرنے کے بہت مشتاق ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ترقی کا یہی راستہ ہے۔ فرانسیسیوں کے عہد میں مدرسے بہت کم قائم کئے گئے۔ جن دنوں شمالی افریقہ میں فرانس کا ڈنکا بجتا تھا، میں ایک فرانسیسی منصبدار سے ملا تو اس نے کہا کہ عربوں کو تعلیم دینا ممکن ہی نہیں۔ کوئی عرب پڑھ لکھ کے اچھا قانون دان یا انجینیئر نہیں بن سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ خرافات ہے۔ فرانسیسیوں نے قصداً عربوں کو تعلیم سے محروم رکھا وہ جانتے تھے کہ تعلیم دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عرب آزاد ہونا چاہیں گے۔ دیکھا گیا ہے کہ جہاں عربوں کو مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ دیا گیا ہے، انہوں نے بہت سے پیشوں میں کمال حاصل کیا ہے

تعلیم یافتہ عرب اکثر مغربی انداز کا لباس نہیں پہنتے (یہ بات ضمناً بیان کی گئی ہے) اکثر عربوں کو اپنا پرانا لباس ہی پسند ہے اسکی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ عرب اپنا پرانا لباس پہن کر نسلی تفاخر کا اظہار کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ عربوں کا پرانا لباس آرام دہ بھی ہے اور جاذب نظر بھی۔



عربوں کے لباس میں بنیادی اہمیت ایک لمبے سے کلاہ دار جبّے کو حاصل ہے کہ گرمیوں میں ٹھنڈک اور سردیوں میں گرمی پہنچاتا ہے۔ اس کی بدولت عرب گرد و غبار اور ریت سے بچے رہتے ہیں۔ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ لباس بیک وقت کوٹ بھی ہے ٹوپی بھی ہے جبّہ بھی ہے کمبل بھی ہے اور شب خوابی کا لباس بھی۔ کبھی کبھی بہت کھلی کلاہ والا جبّہ بھی پہن لیتے ہیں۔ جب کوئی عرب گھر سے باہر سوتا ہے تو وہ اس بڑے جبّے سے بدن کو یوں ڈھانپتا ہے کہ پاؤں کلاہ کے اندر رہتے ہیں۔ جو عرب مغربی انداز کا لباس پسند کرتے ہیں اکثر وہ بھی اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ان کے گھر کی عورتیں مجمع عام میں نہ جائیں اور پردہ کریں یہی وجہ ہے کہ اکثر عرب عورتیں آج تک وہ سفید چادر لپیٹ کر باہر نکلتی ہیں جو صدیوں سے مستعمل ہے اور جو انہیں سر سے پاؤں تک ڈھانپ لیتی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی مالدار خاتون اپنی سپید چادر کے نیچے پیرس میں سلا ہوا سوٹ پہنے ہو۔

کچھ اوصاف عربوں سے مخصوص ہیں کم از کم کہا یہی جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ عرب خاص طور پر ظالم ہوتے ہیں اور وقت آن پڑے تو ایسا جھوٹ بولنے سے بھی دریغ نہیں کرتے جو غداری کی حد تک پہنچا ہوا ہو۔

میں یہ بھی سن چکا ہوں کہ عرب عمارتوں کی مرمت کبھی نہیں کراتے۔ لیپا پوتی کر دیتے ہیں اور بس۔ یہ ایک پرانا مقولہ ہے کہ ایک عرب کو اگر اپنے بیٹھنے کے لئے ایک پتھر کی ضرورت ہے تو وہ کسی عبادت گاہ کو کامل مسمار کر دیگا۔"

ان باتوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عرب صنعت و حرفت میں کمال کی مہارت حاصل کر سکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ عرب کاریگر پاؤں کے انگوٹھے اور

ساتھ کی انگلی میں تیشہ پکڑ کر نہایت نفیس اور لطیف کام کر سکتا ہے۔ اس معاملے میں وہ عدیم النظیر ہے۔ آج کل عرب موٹر چلاتے ہیں، خراد سے کام لیتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ عصرِ حاضر کی صنعتی زندگی کے پیچ و خم سے وہ اچھی طرح آگاہ ہو گئے ہیں۔

عربوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اپنی شخصی جبلتوں کی بنا پر جمہوریت کے شیفتہ ہیں اور اپنے دوستوں اور ہموطنوں پر جان قربان کرنے کے لئے تیار۔ انہیں دنیا میں بسنے والے تمام مسلمان بھائی نظر آتے ہیں۔

عربی کی تحصیل

انگریزی زبان کی طرح عربی میں بھی بہت سی علاقائی بولیاں پائی جاتی ہیں اور یہ ایک دوسری سے اتنی مختلف ہیں کہ ایک علاقے کا رہنے والا کسی دوسرے علاقے کی بولی نہیں سمجھ سکتا۔ جیسا کہ الباما (امریکہ) کے رہنے والوں کے لئے سکاٹ لینڈ کی انگریزی سمجھنا آسان نہیں۔

شمالی افریقہ میں جو عربی بولنے والی قومیں بستی ہیں، وہ ایک دوسرے کی بات سمجھ ہی لیتی ہیں۔ اس کے باوجود ممکن ہے کہ مراکش کا رہنے والا لیبیا والوں کی زبان نہ سمجھ پائے کیونکہ ایک ملک دُور مغرب کی طرف واقع ہے اور دوسرا دور مشرق کی طرف۔

بول چال کی زبان سے قطع نظر کر لیجئے تو کوئی الجھن باقی نہیں رہتی اس کی وجہ یہ ہے کہ جو عربی تحریر میں مستعمل ہے وہ ہر جگہ یکساں ہے۔ چنانچہ مراکش کے باشندے ان اخبارات و رسائل سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو دُور دراز کے ملکوں میں شائع ہوتی ہیں (یعنی عربی میں)۔

عربی بھی عبرانی کی طرح دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے۔ انگریزی کی طرح بائیں سے دائیں نہیں۔ عربی رسم الخط ایک طرح کی مختصر نویسی ہے۔ مثال کے طور پر عربی لفظ جبل (JABEL) کو پہاڑ کہتے ہیں۔ یوں لکھا جاتا ہے ج ب ل۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ہم انگریزی کے کلمات (MAN SPEAKING) کی بجائے (MN SPKNG) لکھیں۔

جب عربی کے کلمات پڑھے جاتے ہیں تو صحیح اعراب لگائے جاتے ہیں اور پھر مطلب سب کی سمجھ میں آجاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جبل کا تلفظ مختلف خطوں میں مختلف ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عربی کلمات کو اس طرح تحریر کرنا مشکل ہے کہ انگریزی بولنے والی قومیں ان کا صحیح تلفظ بھی کر سکیں۔ اشکال کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عربی میں بعض اصوات ایسی ہیں کہ جنہیں ہم کسی طرح انگریزی میں منتقل نہیں کر سکتے کہ ہمارا رسم الخط اس سلسلہ میں ناقص ہے۔

عربی تحریروں میں مختصر نویسی سے کام لیا جاتا ہے جب ہی تو انگریزی بولنے والے لوگ بہت مشکل سے یہ زبان سیکھ پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم سب یہ تو یاد رکھ سکتے ہیں کہ تین حروف ک ت ب کا مطلب "تحریر سے متعلق" ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہی تینوں مل کر مادہ بنتے ہیں اور اس مادہ سے بہت سے مشتقات برآمد ہوتے ہیں، جنہیں یاد رکھنا مشکل ہے۔

ذیل میں کچھ الفاظ نقل کئے جاتے ہیں جو کتب سے مشتق ہیں۔ یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ عربی میں ان سے جو اصوات پیدا ہوتی ہیں وہ انگریزی میں منتقل کر دی جائیں۔

کتابت	KITABAT	تحریر یہ لکھنا
مکتوب	MAKTUB	مسوّدہ
کاتب	KATIB	محرر، منشی، نولیندہ
کتبَ	KATABA	اس نے لکھا
سَیکتُبُ	SEYEKTUB	جلد لکھے گا
یکتُبُ	YEKTUB	لکھے گا۔

اس مختصر نویسی کا نظام اتنا پیچیدہ ہے کہ رسول پاکؐ کا نام نامی انگریزی میں کئی طرح لکھا جا سکتا ہے۔ غالباً صحیح صورت یہ ہے MUHAMMAD۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ ایچ کے نیچے ایک نکتہ دیا گیا ہے کہ عرب جسطرح "ح" کی صورت پیدا کرتے ہیں۔ انگریزی میں اسے منتقل کیا جا سکے۔ ضمناً یہ بھی سُن لیجئے کہ جسطرح انگریزی بولنے والی قومیں اکثر بچوں کا نام (JOHN جان) رکھتی ہیں اسی طرح عرب بھی اپنے بچوں کا نام رسول پاکؐ کے نام پہ رکھتے ہیں یعنی محمدؐ۔

کلمہ مسلم بھی کئی طرح لکھا جاتا ہے۔ انگریز مسلم (MUSLIM) لکھتے ہیں۔ فرانسیسی بولنے والی قومیں مسلمان (MUSALMAN) لکھتی ہیں۔

شمالی افریقہ کے حبشی

عربوں اور اقوام بربر کے علاوہ شمالی افریقہ میں حبشی، یہودی اور یورپی اقوام کے لوگ بھی بستے ہیں ان میں سے کسی فرقے کی تعداد اتنی نہیں کہ عربوں اور اقوام بربر کی تعداد کو چھو بھی سکے۔

غالباً حبشیوں کی تعداد سب سے کم ہے۔ میں غالباً اس لئے کہتا ہوں کہ شمالی افریقہ کے متعلق مستند اعداد و شمار نہیں ملتے۔ بہرحال میں نے دُور تک صحرا میں سفر کیا تو ایک ایسا قصبہ ملا جس کے باشندے کم و بیش سبھی حبشی تھے۔

شمالی افریقہ میں جو حبشی آباد ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد کو غلام بنا کر لایا گیا تھا یہ لوگ ایک عرصہ تک غلام رہے اور ان غلاموں کو آزاد ہوئے ابھی ۳۰ یا ۴۰ برس گزرے ہیں۔ بھلا غلام تعلیم کیوں حاصل کرتے! انہیں تو صرف اپنے آقا کے احکام کی بجاآوری سے کام تھا اس لئے انہیں عربی بقدر ضرورت ہی آتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی حبشیوں کی اکثریت ناخواندہ ہے۔ اب یہ اُمید بندھتی ہے کہ جو نیا شمالی افریقہ وجود میں آ رہا ہے اس کی تعمیر میں حبشی بھی حصہ لیں گے اور ان کا نام بھی مستقبل کے معماروں میں لکھا جائیگا۔ تعلیم کے ذریعے انسان کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ وسطی اور مغربی افریقہ میں حبشیوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے اور یہ لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ دنیا میں اپنا جائز مقام حاصل کر سکیں۔ یہ لوگ بتدریج طاقتور ہوتے جائیں گے اور ان کا شمار بھی سیاست کے مؤثر عوامل میں ہونے لگے گا جب ایسی صورت پیدا ہو گی تو شمالی افریقہ کے حبشی بھی اپنے ہم قوموں کی ترقی سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں گے۔

شمالی افریقہ کے یہودی

شمالی افریقہ میں کم و بیش پانچ لاکھ یہودی آباد ہیں اور ان کی بہت بڑی تعداد مراکش میں رہتی ہے۔ یہاں عرب اور یہودی مل جل کر تعاون سے زندگی بسر کرتے رہے ہیں اور یہی مراکش کی ایک خصوصیت شمار ہوتی تھی،

لیکن پچھلے دنوں تاریخی کوائف اور مذہبی رجحانات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ یہودیوں اور عربوں میں اختلافات پیدا ہو گئے اور بڑھتے ہی چلے گئے۔

شمالی افریقہ کے یہودیوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کے آباؤ اجداد آج سے ۱۰۰ سال پہلے فرانس۔ اطالیہ اور ہسپانیہ کے آباد کاروں کے ساتھ افریقہ پہنچے تھے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو یورپین کہلانا پسند کرتے تھے۔ ان لوگوں کے علاوہ شمالی افریقہ میں مختلف جگہ یہودیوں کی بستیاں بھی پائی جاتی ہیں جو صدیوں پہلے آباد ہوئی تھیں اور جن کے رہنے والے مذہبی معاملات میں متعصب سمجھے جاتے ہیں۔ ان بستیوں میں قدیم ترین غالباً جزیرہ جربہ ہے جو تیونس کے ساحل پر واقع ہے (یہ بستی ۱۹۰۰ سال پہلے آباد ہوئی تھی)۔

ان یہودی آباد کاروں میں اچھے کھاتے پیتے لوگ بھی ہیں اور قلاش بھی مثلاً مراکش کے شہر طنجہ میں، ان یہودیوں کی اولاد آباد ہے جو پندرھویں صدی میں ہسپانیہ سے آئے تھے۔ یہ لوگ بہت معزز اور باثروت ہیں لیکن کوہسار اطلس کے عقب میں جو یہودی دیہات میں رہتے ہیں وہ بالکل قلاش ہیں۔ یہودیوں کو شمالی افریقہ کے شہروں میں اس لئے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا کہ اکثر و بیشتر یہ لوگ ہنرور ہوتے تھے، یہودی درزی اور نگینہ ساز خاص طور پر مشہور تھے۔

علاوہ ازیں جو کام مسلمان خود نہ کر سکتے تھے یا کرنا نہ چاہتے تھے وہ یہودیوں سے لیا جاتا تھا۔ مثلاً یہودیوں کا ایک کام یہ تھا کہ وہ ان لوگوں کے سروں کو نمک لگا کر محفوظ رکھیں جو سلطان کے حکم سے قتل کئے جاتے تھے۔ تاکہ بوقت ضرورت لوگوں کو عبرت کے طور پر دکھائے جا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ

آج بھی یہودیوں کے محلّوں کو "مسلح" کہتے ہیں (اس کلمے کے معنی ہیں، نمک)
مسلمانوں کے لئے سود کھانا حرام ہے اس لئے روپے کے لین دین کا
کام یہودی ہی کرتے ہیں۔ بنک کار بھی یہی لوگ تھے اور اس حیثیت سے ان
کا بڑا رسوخ تھا اب ممکن ہے حالات بدل جائیں کہ دولت مند مسلمان بھی
اس بات پر غور کر رہے ہیں کہ اپنا روپیہ سود پر چڑھا کر نفع حاصل کریں۔

یورپی اقوام کے لوگ

کچھ عرصہ پہلے شمالی افریقہ میں جس جماعت
کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی وہ تعداد
میں بہت قلیل تھی، یعنی یورپی اقوام کے آباد کار۔ ان میں سے اکثر فرانسیسی تھے،
کچھ ہسپانوی اور کچھ اطالوی اور کچھ سسلی اور کارسیکا کے رہنے والے۔ افریقہ کے
دو کروڑ باشندوں میں ان کی تعداد صرف بیس لاکھ تھی لیکن اربابِ اقتدار یہی لوگ
تھے اور اپنی من مانی کرتے تھے تاآنکہ قومی تحریکات شروع ہوئیں اور ان کی
شدّت نے ان کو حواس باختہ کر دیا۔

فرانسیسی مراکش میں فرانسیسی آباد کاروں کے یہ ٹھاٹھ تھے کہ جتنی زمین قابلِ
کاشت تھی وہ کم و بیش ان ہی کی ملکیت تھی اور مراکش کے لاکھوں باشندے ایسے
تھے جن کے قابلِ زراعت زمین کا ایک بسوہ بھی نہ تھا اور وہ آباد کاروں کے
ہاں معمولی تنخواہ پر ملازم تھے۔ حکومت کے تمام چھوٹے بڑے عہدے دار بھی
یہی آباد کار تھے حد یہ تھی کہ کسی ایسے محلے کے لئے جہاں صرف عرب آباد ہوں
پوسٹ ماسٹر بھی فرانسیسی ہوتا تھا کیونکہ فرانسیسیوں کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ عربوں
کو یہ معمولی عہدہ بھی دیا جائے۔ یوں کہیے کہ انجنیئر، قانون دان، ڈاکٹر، ہوٹل

کے مالک، شراب فروش اور بڑی بڑی دوکانوں کے ملازم (ان میں عورتیں بھی شامل تھیں) سب ہی فرانسیسی تھے۔

فرانسیسی آبادکار اپنی دانست میں ایک پسماندہ ملک کو تربیت دے رہے تھے۔ انہیں ناز تھا کہ ہم نے سڑکیں تعمیر کی ہیں شہر کو صاف ستھرا رکھنے کا انتظام کیا ہے، کانیں کھود دی ہیں اور کارخانے قائم کئے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ مقامی باشندوں کا فرض ہے کہ وہ انہیں اپنا آقا سمجھیں۔ یہ آبادکار مقامی باشندوں کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جب عربوں سے بات کرتے تھے تو انداز یہ ہوتا تھا گویا کسی بچے یا ملازم سے بات کر رہے ہیں۔ عربوں کے پیٹھ پیچھے انہیں نئے نئے حقارت آمیز الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ عربوں کو غلیظ کہنا تو گویا ان کا تکیہ کلام تھا۔

انہیں احساس تک نہ ہوتا تھا کہ ان کا یہ طرزِ عمل غلط ہے۔ میں نے ایک بار اس مسئلے پر گفتگو چھیڑی تو وہ مجھ سے الجھ پڑے اور کہنے لگے کہ امریکیوں نے پرانے وقتوں میں ریڈ انڈینز سے کیا سلوک کیا تھا اور آج حبشیوں سے کیا سلوک کرتے ہیں۔ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کے الزام میں جزواً صداقت موجود تھی۔ جہاں تک مختلف قوموں کے ساتھ مل جل کر رہنے کا تعلق ہے ابھی امریکہ کو اس سلسلے میں بہت کچھ کرنا ہے۔

بہرحال شمالی افریقہ کے باشندے اس حقارت آمیز طرزِ عمل کی وجہ سے بتدریج یورپی آبادکاروں سے نفرت کرنے لگے اور یہ نفرت بڑھتی ہی چلی گئی۔ اب انہیں یورپی آبادکاروں کی ہر بات بری معلوم ہوتی تھی۔ وہ ان کی دولت اور رسوخ سے سخت جلتے تھے اور کھلم کھلا یہ کہتے تھے کہ یہ لوگ غاصب ہیں۔ اس کے علاوہ اقوام بربر اور عربوں کے خون کھول جاتے تھے۔ جب یہ آبادکار انہیں غلیظ کہتے تھے۔

آخر کار ان آباد کاروں کے خلاف تحریکات زور پکڑ گئیں۔ شمالی افریقہ کے باشندوں نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے ملک پر آپ حکومت کریں گے چاہے اس راستے میں انہیں کتنی ہی کٹھن منزلوں سے گزرنا پڑے۔ ان کے لئے یہ ناقابلِ برداشت ہو گیا کہ اغیار ان پر حکومت بھی کریں اور ان کے ملک کی تمام دولت سمیٹ کر اپنے تصرف میں بھی لائیں۔ یہی محرکات جنگِ آزادی کا باعث ہوئے اور یہ جنگِ آزادی مراکش، تیونس، الجزائر اور لیبیا کی حالیہ تاریخ میں سب سے اہم واقعہ ہے۔

(۴)

مراکش

آج مراکش میں پرانی اور نئی قدریں آپس میں ٹکرا رہی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہر چیز سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ نئی حاصل کردہ آزادی پرانی روایات سے ٹکراتی ہے۔ اونٹ اور گدھے خراماں خراماں چلتے ہوئے گویا تیز رفتار ٹرکوں اور بسوں کو مقابلے کی دعوت دیتے ہیں۔

شمالی افریقہ کے تمام علاقوں میں یہی کیفیت نظر آتی ہے، لیکن مراکش کا جغرافیائی محلِ وقوع ایسا ہے جہاں اس کیفیت کے شدید ترین مظاہر دیکھے جا سکتے ہیں۔ مراکش افریقہ کے شمال مغربی گوشہ میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ ایک لاکھ ستّر ہزار مربع میل ہے۔ اس کا ایک رُخ، آبنائے جبل الطارق کا ساحل ہونے کی وجہ سے یورپ کی طرف ہے تو دوسرا رُخ کرۂ مغربی کی طرف ہے۔ اس کے ساحل کے متوازی ایک سلسلہ کوہسار ہے جس کو اطلس کہتے ہیں۔ یہ سلسلہ کوہ مراکش کو باقی ماندہ افریقہ سے علیحدہ کرتا ہے۔

تُرک جب تسخیرِ ممالک کے لئے نکلے تو انہوں نے وہ تمام ملک فتح کر لئے جو مراکش کے مشرق میں واقع تھے لیکن وہ اصل کوہسار کو عبور کر کے مراکش کی طرف بڑھنے کی ہمت نہ کر سکے۔ اسی طرح عربوں کی تسخیر کا سیلاب چڑھتا بھی رہا اور اُترتا بھی رہا اور صدیوں تک ایسا ہوتا رہا۔ لیکن مراکش تک اس سیلاب کی لہریں

بہت کم پہنچیں۔ آج کل طنجہ اور کاسابلانکا میں یورپی اقوام اور امریکہ کا اثر بہت ہے۔ لیکن یہ ساحلی علاقے ہیں۔ پہاڑوں کے اس پار کوئی جاتا بھی نہیں کہ یورپین کون ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مراکش میں عجیب و غریب تضاد نظر آتا ہے۔ ایک طرف کاسابلانکا میں جدید وضع کی بلند عمارتیں جگمگ جگمگ کر رہی ہیں اور دوسری طرف کوہسار اطلس کی وادیوں میں کسی قبیلے کا مٹی کا قلعہ پرانے وقتوں کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مراکش دنیا کے باقی حصوں سے بالکل منقطع معلوم ہوتا ہے۔ میں دو اسلامی ملکوں کے سوا تمام دنیائے اسلام کی سیر کر چکا ہوں۔ مراکش پہنچ کر یوں گھٹن محسوس ہوتی ہے جیسے کسی کو محبوس کر دیا گیا ہو۔ یہ بات کسی اور اسلامی ملک میں نہیں ہے۔

پہاڑوں کا جو سلسلہ مراکش کو شمالی افریقہ کے باقی حصوں سے جدا کرتا ہے وہی باشندوں کو بھی دو جماعتوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ یعنی شہروں اور میدانوں میں بسنے والے اور پہاڑی علاقوں میں رہنے والے۔

باشندوں کی اکثریت شہروں میں بستی ہے۔ یہ باشندے یا تو عرب ہیں یا اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو عربوں اور اقوام بربر کے اختلاط سے وجود میں آئی ہے۔ ان کی تعداد ساٹھ لاکھ کے قریب ہے۔ فرانسیسی آبادکار بھی جن کی تعداد تین لاکھ کے لگ بھگ ہے، مراکش کے شہروں اور میدانوں ہی میں آباد ہیں۔ اسی طرح یہودی اور یورپی اقوام کے لوگ بھی یہیں بستے ہیں۔

اقوام بربر دور افتادہ پہاڑی علاقوں میں آباد ہیں۔ ان کی تعداد تیس لاکھ کے قریب ہے اور یہ تین سو چھہتر قبیلوں میں منقسم ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں

یہ ٹھری طبیعت کے لوگ ہیں اور الگ تھلگ آزادانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ مراکش کے سلطانوں کو یہ سعادت کم ہی نصیب ہوتی تھی کہ اقوام بربر بھی ان کی مطیع ہوجائیں، بالفاظ دیگر مراکش کے سلطان اِس ملک کے چوتھے حصے پر حکمران ہوتے تھے۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مراکش کی تاریخ مختصراً بیان کر دی جائے کہ آجکل جو کچھ ہو رہا ہے وہ تبھی سمجھ میں آسکتا ہے کہ ہم تاریخی پس منظر سے آگاہ ہوں۔

آٹھویں صدی میں عربوں کے وہ مقبوضات جو شام اور ہسپانیہ کے درمیان واقع تھے، بتدریج ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ انھی دنوں ادریس نامی ایک باہمت رہنما نے، کہ آل رسولؐ ہونے کا مدعی تھا، خلیفہ وقت کے خلاف بغاوت کی۔ ۷۸۸ء میں اُس نے رومن شہر والوبی لس کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا اور مراکش کی نئی سلطنت کا فرمانروا بن بیٹھا۔

تھوڑے دنوں بعد خلیفہ نے ادریس کو اپنے ایک خاص آدمی شماخ کے ذریعے زہر دلوا دیا اور اس کی موت واقع ہوگئی۔ اُس کے جانشینوں میں ایسے سلطانوں کی کمی نہیں جو اسی طرح ناگہاں ہلاک کروا دیئے گئے ہوں۔ اِن سلطانوں کا عہدِ حکومت بھی مختصر ہوتا تھا۔ تخت و تاج کے بعض مدعی تو منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ مراکش میں یہ دستور تھا کہ باپ کے بعد سب سے بڑا بیٹا تخت پر بیٹھے۔ بلکہ دستور یہ تھا کہ شہر فیض کے ممتاز علما مل کر فیصلہ کرتے تھے کہ شاہی خاندان میں سے کس کو تخت پر بٹھایا جائے۔

روما میں رومن کیتھولک چرچ کے قواعد کے مطابق کارڈینل پوپ کا انتخاب کرتے ہیں۔ اسی طرح فیض کے علما مراکش کا فرمانروا چنتے ہیں۔ پوپ اور سلطان

مراکش کے انتخاب میں ایک عنصرِ مشترک یہ بھی ہے کہ پوپ کی طرح مراکش کا سلطان بھی اپنے ملک کا مذہبی راہنما تصور کیا جاتا تھا۔ عوام کو یہ اعتماد ہوتا تھا کہ علمائے قوم سلطان کے خاندان میں سے اسی کو چنیں گے جو دینی اور دنیوی معاملات میں بصیرت رکھتا ہوگا۔

نظریاتی اعتبار سے تو انتخاب کا مسئلہ بہت سیدھا سادا تھا لیکن ایسا بھی ہوتا کہ مدعیانِ تاج و تخت ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جاتے تھے اور عملاً فیصلہ دھڑا کا دھڑا رہ جاتا تھا۔ ۸۰۸ء سے ۱۹۱۲ء تک مراکش پر ایک سو پندرہ سلطانوں نے حکومت کی ہے اور یہ سلطان نو مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ چھ بربر اور تین عرب۔ موجودہ فرمانروا عرب ہے۔ اور دودمانِ شریف کا رکن ہے کہ ۱۶۶۸ء سے یہ خاندان تختِ حکومت پر متمکن ہے۔ مراکش کا لفظ اب استعمال ہوتا ہے پہلے اس ملک کو سلطنتِ شریفیہ کہتے تھے۔

جب یورپی اقوام نے افریقہ کے حصے بخرے کرنے شروع کئے تو فرمانروا طبعاً مضطرب ہوئے۔ ۱۸۷۱ء میں سلطان مراکش نے امریکہ سے درخواست کی کہ مراکش کو اپنے ظلِ حمایت میں لے لے۔ لیکن امریکہ اُن دنوں اپنے مغربی علاقوں کو آباد کرنے میں مصروف تھا چنانچہ فرانس کے لئے راہ کھل گئی جو عرصے سے مراکش کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

فرانس نے اِس ملک کو بزورِ شمشیر فتح کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح تمام دنیا فرانس کی مخالف ہو جاتی۔ فرانس نے دوسری یورپی سلطنتوں سے سازباز شروع کی۔ انگلستان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر فرانس کو مراکش میں من مانی کرنے کی اجازت دی جائے تو وہ مصر میں انگریزوں کو کھلی چھٹی دے گا ایسی ہی

تجاویز جرمنی اور اطالیہ کے سامنے رکھی گئیں۔ ہسپانیہ سے یہ وعدہ کیا گیا کہ مراکش کے مال غنیمت میں سے اُسے بھی حصّہ دیا جائیگا۔

۱۹۱۲ء میں فرانسیسیوں کو مداخلت کا بڑا اچھا موقع ملا۔ ہُوا یہ کہ بربروں نے سلطان کے دارالسلطنت کا محاصرہ کر لیا۔ وہ اسے تخت سے اتارنا چاہتے تھے۔ سلطان نے فرانس سے مدد مانگی۔ فرانس نے اپنی فوجیں بھیج دیں۔ محاصرین بھاگ گئے اور فرانس نے اعلان کیا کہ مستقبل میں سلطان اور ملک کے مفاد کی حفاظت ہم ہی کریں گے۔ اس کے بعد مراکش تین حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ فرانسیسی مراکش، ہسپانوی مراکش اور طنجہ کا علاقہ، جسے بین الاقوامی علاقہ قرار دیا گیا۔

بظاہر فرانس مراکش کی سرزمین پر قابض ہو گیا لیکن حقیقت یہ تھی کہ مختلف شہروں میں لڑائی جاری تھی اور ایک عرصہ تک جاری رہی۔ پہاڑی علاقوں میں خاص کر کوہسار اطلس کے جنوب میں بیس سال تک ہنگامہ برپا رہا۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ مراکش پر فرانس کا پوری طرح تسلط کبھی نہ ہو سکا۔

ہسپانوی مراکش کا رقبہ نسبتاً کم تھا (یہ علاقہ ملک کے شمال مشرقی کونے میں واقع تھا) لیکن اس علاقہ پر ایک طویل مدت تک پوری طرح تسلّط قائم نہ ہو سکا، کہ مراکش کے باشندے غیر ملکی حکومت کے مقابلے میں برابر ڈٹے رہے۔ طنجہ کا شہر آبنائے جبل الطارق کے قریب واقع ہے جو بحیرۂ روم کا دروازہ ہے۔ اس شہر کا محل وقوع ایسا تھا کہ اس پر کسی ایک ملک کو متصرّف ہونے کی اجازت نہ دی جا سکتی تھی۔ چنانچہ بہت سے ملکوں نے مل کر اس کا انتظام سنبھالا۔ مراکش کے

حصے بخرے کر لینے کے بعد فرانس اور ہسپانیہ نے بھی طنجہ کے بین الاقوامی نظم و نسق کی مخالفت سے گریز کیا۔

مراکش میں فرانسیسیوں کی حکومت ۱۹۱۲ء سے لیکر ۱۹۵۶ء تک یعنی مراکش کے آزاد ہونے تک، اس ملک کا نشیب و فراز دراصل فرانسیسی حکمرانی کی داستان ہے۔

پہلے تیرہ سال تک ایک باحوصلہ شخص جو مارشل لالیوٹی کہلاتا تھا، مراکش کا حاکم رہا۔ اس نے نظم و نسق بھی قائم کیا اور امن بھی قائم کیا۔ سرکاری کاغذات میں اسے ریذیڈنٹ جنرل کہا جاتا تھا اور اس کے دفتر کو ریذیڈنسی۔ یہ ریذیڈنسی ہی مراکش کی حکومت کا مرکز تھی۔ مارشل لالیوٹی کا مارکاری کی تاریخ میں بڑا بلند مقام رکھتا ہے اور اعلیٰ درجہ کا منتظم شمار ہوتا ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ مارشل موصوف کو مراکش اور یہاں کے باشندوں سے بڑی محبت تھی۔ وہ مقامی روایات کا بہت احترام کرتا تھا۔ پہلے تو لوگوں نے اسے اجنبی فاتح سمجھا لیکن بتدریج وہ مقبول و محبوب ہوتا چلا گیا۔

مارشل موصوف کے اسلوب فکر کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے، جو درج ذیل ہے۔ ایک دن وہ گھوڑے پر سوار رباط کے شہر میں پھر رہا تھا۔ (فرانسیسیوں نے اسے دارالسلطنت قرار دیا تھا) اس نے دیکھا کہ فرانسیسی مزدور اور معمار اس کا دفتر تعمیر کر رہے ہیں۔ یہ عمارت پرانے شہر کے عین وسط میں بنائی جا رہی تھی۔

مارشل لالیوٹی اس عمارت کو دیکھ کر جیسے چونک پڑا اور ایکا ایکی بولا اس عمارت کو گرا دو۔

ان لفظوں میں وہ حکمتِ عملی مضمر ہے جو لایوٹی کے پیشِ نظر تھی۔ اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ عربوں کی اجتماعی آبادی اور وضع زلیست میں تغیر پیدا کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اس نے حکم دیا کہ ریذیڈنسی کی عمارت پرانے شہر سے ہٹ کر بنائی جائے۔ اسی حکمتِ عملی کا نتیجہ ہے کہ مراکش کے شہروں میں عرب اور فرانسیسی علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں۔

لایوٹی کی انتظامی قابلیت اور سیاسی تدبر کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ مراکش پر اسطرح حکومت کرتا تھا کہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اور مراکش کا سلطان مل کر حکومت کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ مارشل موصوف قوانین وضع کرتا تھا اور وہ سلطان کے دستخطوں سے نافذ ہوتے تھے جیسے سلطان نے خود یہ قوانین وضع کیے ہوں۔ اگر لوگوں کو احساس ہو جاتا کہ ان کے سلطان کو حکومت کے معاملات میں کوئی دخل نہیں رہا ہے تو وہ یقیناً بھڑک اُٹھتے۔

لایوٹی اس نتیجے پر پہنچا کہ پرانے قبائلی رسوم و رواج کے استیصال کی کوشش بے سود ہے اور یہ بہت معقول بات تھی کیونکہ یہ رسمیں صدیوں سے رائج تھیں اور لوگوں کو بہت عزیز بھی تھیں۔ پرانی روایات مٹانے کے بجائے اس نے ان روایات سے فرانسیسی اقتدار کی گرفت کو مضبوط کرنے کا کام لیا اس نے کسی قبیلے کے سردار کو معزول نہیں کیا، بلکہ یہ حکم جاری کیا کہ ہر قبیلے کا سردار میرا نائب ہے۔ یوں سردار بھی اسے اچھا جاننے لگا اور قبیلے کے لوگ بھی خوش رہے۔

عرب قوم تو اس نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے لگی۔ لیکن اقوام بربر کی

صورت دوسری تھی۔ جو قبیلے پہاڑی علاقوں میں رہتے تھے انھوں نے کبھی سلطان کی اطاعت نہیں کی تھی وہ فرانس کو کیا خاطر میں لاتے، چنانچہ لایوٹی نے اب یہ کیا کہ ایک ایک کرکے بڑے بڑے قبیلوں کے شیوخ سے ملاقات کی اور اپنے حسنِ خلق سے اکثریت کو اپنے ساتھ ملا لیا۔

مراکش کا پاشا ابتدا ہی میں اس کے ساتھ ہو گیا تھا وہ صاحب اختیار بھی تھا اور وفادار بھی۔ اس شخص کو حاجی ٹہامی غلاوی المزوراری کہتے تھے مگر صرف الغلاوی کہہ کر پکارتے تھے۔ جن لوگوں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے ان میں یہ بوڑھا سردار بھی شامل ہے۔ جس کی وضع قطع بہت دلفریب تھی۔ اسے اس بات پر ناز تھا کہ میں نے اپنی جوانی میں ایک سو اکیس لڑائیوں میں حصّہ لیا ہے، اور بہت سے آدمی ہلاک کیئے ہیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ ایک جنگجو سپاہی ہی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا، سیاست کی گتھیاں سلجھا سکتا تھا اور دنیا کے نشیب و فراز سے خوب آگاہ تھا۔ غالباً وہ آخری جاگیردار تھا جس نے نجی طور پر ایک فوج ملازم رکھ چھوڑی تھی۔ اس کے سپاہیوں کی تعداد تین لاکھ تھی اور یہ سب بربر تھے۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ غلاوی فرانسیسیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھا حقیقت یہ ہے کہ وہ فرانسیسیوں کو اچھا جانتا تھا اس لیے ان سے تعاون کرتا تھا۔ مراکش کا جنوبی حصّہ اسی کے ماتحت تھا اور اس کی نیم خود مختار سلطنت میں امن و امان قائم تھا۔ وہ اس بات پر بھی راضی تھا کہ فرانسیسیوں کے ساتھ مل کر اپنے باغی ہموطنوں کو شکست دے۔ مختصر یہ ہے کہ مراکش میں فرانسیسی

اقتدار کا سنگِ بنیاد ہی غلام دی تھا۔

جن دنوں لایوٹی فرانسیسی مراکش کی انتظامی گتھیاں سلجھا رہا تھا۔ انہی دنوں ہسپانوی بھی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ بات یہ تھی کہ ریف کے پہاڑی علاقے میں جہاں کسی کا گزر بھی مشکل تھا، کچھ بربر قبیلے آباد تھے۔ ۱۹۲۰ء میں ان قبیلوں کے ایک سردار عبدالکریم نامی نے اپنے ہم وطنوں کو ہسپانیہ کے خلاف جہاد پر اکسایا تا آں کہ ہسپانیہ سے باقاعدہ لڑائی ہونے لگی۔ اُس وقت فرانس ہسپانیہ کی مدد نہ کرتا تو ان کی بازی مات ہو چکی تھی۔ یورپی طاقتوں کے پاس ہوائی جہاز تھے، موجودہ زمانے کے ہتھیار تھے، لیکن اس کے باوجود ریف کے مجاہدوں کو کچلنا آسان کام نہ تھا۔ حالانکہ وہ بے چارے پوری طرح مسلح بھی نہ تھے۔ آخر کار عبدالکریم کو جلاوطن کر دیا گیا۔ لیکن ہسپانوی اتنے خوف زدہ ہو گئے کہ انہوں نے ان پہاڑی علاقوں کے ہر گاؤں میں فوج کا ایک دستہ بٹھا دیا۔

۱۹۲۶ء میں لایوٹی اپنے وطن فرانس لوٹ گیا لیکن وہ فرانسیسی مراکش کو جو تیرہ سال پہلے معمولی دیہات کا مجموعہ تھا، موجودہ زمانے کے ملکوں کی طرح شاہراہِ ترقی پر گامزن کر گیا۔ اس کے جانشینوں نے بھی اسی کی حکمتِ عملی کو ملحوظ رکھا۔

مراکش میں فرانسیسی اقتدار کے اثرات کئی طرح ظاہر ہوئے۔ ایک طرف تو یہ کہ نئے فرانسیسی آباد کار مراکش کے لوگوں کو بہت بُرے لگنے لگے لیکن دوسری طرف یہ بھی تھا کہ ان لوگوں نے محنت کی اور اس زمین کو زیرِ کاشت لائے جو اس سے پہلے بنجر سمجھی جاتی۔ ان کی محنت کی وجہ سے معمولی زمینوں نے بھی زیادہ فصل دی۔ بات یہ ہے کہ یہ لوگ موجودہ طریقوں کے مطابق زمینیں کاشت کرتے تھے۔

ان کے پاس مشینری تھی، اچھے بیج تھے، مویشی تھے، کیمیائی گھاد تھی۔ انہی کی کاوشوں سے گندم دس گنا زیادہ پیدا ہونے لگا۔ کھجوریں پانچ گنا اور زیتون چالیس گنا۔

جب لایوٹی ۱۹۱۲ء میں آیا تو ملک میں نہ کوئی پل تھا، نہ کوئی ریل تھی، سڑکیں اول تو تھیں ہی نہیں اور جو تھیں ان کی حالت بہت ردی تھی۔ مارشل لایوٹی نے سات ہزار میل لمبی شاہراہیں بنوائیں۔ گیارہ سو میل لمبی ریل کی پٹڑی بچھوائی۔ آٹھ نئی بندرگاہیں تعمیر کیں۔ اٹھانونے ہوائی اڈے بنائے۔ اس کے علاوہ بند بھی بڑی کثرت سے تعمیر کئے کہ کاشتکاری کے لئے پانی بھی بآسانی مہیا ہو سکے اور پن بجلی پیدا کی جا سکے۔

جگہ جگہ کارخانے قائم کئے گئے یہاں تک کہ دو لاکھ مراکشی کارخانوں میں ملازم ہو گئے۔ کوہسارِ اطلس کی معدنی دولت کا جائزہ لیا گیا اور موجودہ طریقوں کے مطابق کان کنی ہونے لگی۔

صحتِ عامّہ کے سلسلے میں اور بھی زیادہ مفید کام کیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں یہاں صرف ایک ہسپتال تھا اور ایک دماغی امراض کا شفاخانہ، جہاں مریضوں کو دن رات پابہ زنجیر رکھا جاتا تھا۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۵۵ء تک فرانسیسیوں نے پانچ سو ہسپتال تعمیر کئے۔ ہر سال مراکش کے لاکھوں باشندے مفت طبی مشورہ حاصل کرتے تھے۔ ملیریا کا زور توڑ دیا گیا۔ وبائی بیماریوں مثلاً چیچک، پلیگ اور تپِ محرقہ کا استیصال کر دیا گیا۔

ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں فرانس کو بہت روپیہ صرف کرنا پڑا۔ ہر سال کئی لاکھ فرانک مراکش کے لئے وقف کئے جاتے تھے لیکن خود فرانس کو بھی مراکش سے فائدہ پہنچتا تھا کہ یہاں کی صنعت اور تجارت سے جو نفع ہوتا تھا وہ بیشتر فرانسیسیوں ہی


کی جیب میں پہنچتا تھا۔ علاوہ ازیں فرانس نے تین لاکھ آباد کار مراکش بھیج دیئے جن کے لئے فرانس میں کوئی جگہ نہ تھی۔ مراکش میں وہ کھاتے پیتے لوگ ہو گئے۔

باقی رہے مراکش کے باشندے تو ان کا ردِ عمل مختلف تھا۔ کچھ لوگ یہ کہتے تھے کہ فرانس نے ہمارے ملک کو متحد اور منظم کر دیا ہے اور ہم ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ وہ غریب جو عمر بھر افلاس میں گرفتار رہے تھے انہیں باقاعدہ تنخواہ ملنے لگی کہ فرانسیسی کارخانوں میں ملازم ہو گئے تھے۔

لیکن کچھ عرصہ کے بعد عربوں نے یہ محسوس کر لیا کہ فرانسیسی کارخانہ داروں کو بہت نفع حاصل ہوتا ہے، اس کے مقابلے میں ہمیں کچھ نہیں ملتا۔ ساتھ ہی عرب یہ بات بھی سمجھ گئے کہ وہ اور ان کی اولاد اچھے عہدوں پر کبھی فائز نہ ہو سکیں گے کیونکہ انہیں اچھی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع ہی نہیں ملتے۔ اس لئے وہ صرف نہایت معمولی ملازمت ہی کے اہل رہیں گے۔ عربوں کے شعور کو ان سب باتوں سے ٹھیس پہنچی اور انہیں فرانسیسیوں کا سیاسی اقتدار سخت ناگوار گزرنے لگا۔ اس پر طرّہ یہ تھا کہ فرانسیسی انہیں "گندے چلیۂ" کہہ کر پکارتے تھے۔ عربوں کے دلوں میں بتدریج یہ خیال جڑ پکڑ گیا کہ مراکش کے باشندوں کو بھی حکومت میں دخیل ہونا چاہیئے۔ ان میں سے کچھ لوگ تو یہ کہتے تھے کہ فرانسیسیوں کو ملک سے نکال دینا چاہیئے۔ یہی لوگ مراکش کے قوم پرست کہلائے جنہوں نے صاف بیانی سے کام لیا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ آزادی کی تحریک بتدریج سلگتے سلگتے شعلہ بن گئی۔ کم از کم دوسری جنگِ عظیم تک یہ تحریک کچھ دبی دبی سی رہی تھی۔ لیکن ۱۹۲۷ء میں بھی قوم پرست عرب موجود تھے۔ انہی دنوں ایک نیا سلطان تخت پر بیٹھا۔ یہی سلطان انیس سالہ





کے بعد بھی فرمانروا تھا جبکہ مراکش ایک آزاد ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر اُبھرا تھا۔ اگرچہ اسے بہت کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑا تھا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ مراکش کی تحریک آزادی محمد بن یوسف کی زندگی کی داستان ہے۔ جسے دوسری قومیں سلطان محمد پنجم کے نام سے پہچانتی ہیں۔

سُلطان محمد پنجم

سلطان محمد پنجم سترہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا فیض کے علماء نے اسے دو بڑے بھائیوں پر ترجیح دی کہ فرانسیسی اس کے حق میں تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ نوعمر سلطان ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ہوگا اور وہ جسطرح چاہیں گے اپنی من مانی کریں گے۔

کچھ عرصے تک تو یہی معلوم ہوتا تھا جیسے فرانسیسیوں نے ٹھیک انتخاب کیا ہے۔ سلطان محمد پنجم چپ چاپ تمام فرمانوں پر دستخط کر دیتا تھا۔ اسے صرف اس سے دلچسپی تھی کہ گلچھرے اُڑائے اور بے تحاشا روپیہ خرچ کرے۔

اس کے پاس روپیہ تھا بھی بہت۔ اُس کی تنخواہ قریباً چالیس لاکھ سالانہ تھی۔ اس کے علاوہ آمدنی کے ذرائع اور بھی تھے مثلاً جب وہ کسی قائد یا پاشا کا تقرر کرتا تو پرانے رواج کے مطابق اس کی خدمت میں تحفے پیش کئے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں پاشا سال میں تین بار سلطان کی خدمت میں قیمتی ہیرے پیش کرتے تھے اور یہ ہیرے خاصے گراں بہا ہوتے تھے۔ پھر سلطان مراکش کے نظامِ معدلت کا چیف جسٹس بھی تھا۔ یوں کہہ لیجئے کہ ایک سلطان کو عدالت عالیہ کے کل اختیارات حاصل تھے۔ وہ مختلف مقدمات کے فیصلے کرتا تھا تجارتی فیصلے، جائداد کے جھگڑے سب سے آخر میں اسی کے سامنے پیش ہوتے تھے اور ان دنوں مراکش میں انصاف خریدا جاسکتا تھا۔

ان حالات میں سلطان محمد پنجم نوعمری ہی میں بہت امیر ہو گیا، یہاں تک کہ اس کے پاس ایک کروڑ روپیہ جمع ہو گیا۔ کم از کم مشہور یہی تھا۔

یہ درست ہے کہ اسے شاہی حیثیت کو برقرار رکھنا پڑتا تھا۔ اس کے ساٹھ محل تھے۔ ہزاروں ملازم تھے۔ اس کے علاوہ حاشیہ بردار بھی تھے جنہیں سلطان کے دروازے سے خالی ہاتھ نہیں لوٹایا جا سکتا تھا۔ اس کی دو بیویاں تھیں اور پچاس کے قریب کنیزیں تھیں۔ ان تمام اخراجات کے علاوہ وہ اپنی ذات پر کافی روپیہ خرچ کرتا تھا۔ اسے موٹریں جمع کرنے کا ایسا ہی شوق تھا جیسے بعض لوگوں کو ٹکٹیاں جمع کرنے کا ہوتا ہے۔ سلطان ایک چھوٹی سی موٹر خود چلاتا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ سے چیزیں بنانے کا بڑا شوق تھا سلطان دوہرے بدن کا تھا لیکن کھیلوں کا شائق۔ ٹینس بہت اچھی کھیلتا تھا۔ شاہی باورچی خانے کا ایک ملازم اسے ٹینس کھلاتا تھا جو اس فن میں ماہر تھا۔ ممکن ہے فرانسیسیوں نے سلطان محمد کے یہ جمہوری رجحانات دیکھے ہوں۔ کم از کم انہوں نے ان باتوں کیطرف خاص توجہ نہیں دی، وہ یہ سمجھتے تھے کہ سلطان محمد واقعی کٹھ پتلی ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ سلطان کو ایک چھوٹی سی کار پسند تھی یعنی رینالٹ جسے وہ خود چلاتا تھا۔ اسے چھوٹی چھوٹی چیزیں بنانے کا بہت شوق تھا اور ریل چلانے کا بھی۔

اگر فرانس والوں نے سلطان کے جمہوری رجحانات دیکھے بھی تو انہوں نے چنداں پرواہ نہ کی۔ ان کا خیال تھا کہ سلطان ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا رہے گا۔ اور یہ درست ہے کہ کچھ عرصہ تک یہی صورت قائم رہی۔

دوسری جنگ عظیم سے ذرا پہلے فرانسیسیوں کو معلوم ہوا کہ پڑھے لکھے عربوں کی ایک جماعت اکثر اس خیال کا اظہار کرتی رہتی ہے کہ آخر کار مراکش کو آزاد ہونا ہے۔

فرانسیسی ارباب اقتدار نے اس تحریک کے رہنماؤں کو جلاوطن کر دیا اور سمجھا کہ اس کے بعد کوئی گڑبڑ نہ ہوگی کہ وہ سلطان کی اعانت سے آزادی کے شعور کو کچل کر رکھ دیں گے۔

دوسری جنگِ عظیم کے آغاز (۱۹۳۹ء) سے حالات بہت تیزی سے بدلنا شروع ہوئے۔ نازی جرمنوں نے فرانس کو فتح کر لیا اور دیس میں ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کر دی جس کا دائرۂ اختیار شمالی افریقہ تک پھیلا ہوا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں امریکی فوجیں کاسابلانکا میں اتریں اور بحیرۂ روم کے جنوبی ساحل پر لڑائی چھڑ گئی۔ جب اتحادیوں نے نازی جرمنی کو شکست دی تو فرانس کی حکومت اپنے ایشیائی مقبوضات پر پھر متصرف ہو گئی لیکن اس سیاسی نشیب و فراز سے افریقہ میں فرانسیسی اقتدار کو سخت ضعف پہنچا تھا۔ مراکش کے لوگوں نے جو فرانس کو جرمنی کے مقابلے میں شکست فاش کھاتے دیکھا تو ان کے لیے اب ناممکن ہو گیا کہ وہ اپنی "محافظ قوم" کا لوہا مانتے رہیں۔ مراکش کی چھوٹی چھوٹی قوم پرست جماعتوں نے مل کر ایک آزاد اور طاقتور سیاسی فریق کی حیثیت اختیار کر لی یعنی یہ سب جماعتیں استقلال پارٹی کی شکل میں منظم ہو گئیں۔ یہ جماعت بے باکانہ آزادی کی طلب گار تھی۔

فرانسیسیوں کا خیال ہے کہ ایک اور بات بھی ایسی ہوئی جس نے ان کے اقتدار کو ضعف پہنچایا۔ اور وہ یہ تھی کہ امریکہ کے صدر فرینکلن ڈی لانو روزویلٹ نے کاسابلانکا کانفرنس میں شرکت کے موقع پر سلطان محمد پنجم کو رات کے کھانے پر بلایا جسے سلطان نے بڑی خوشی سے منظور کر لیا۔

"یہ بات شاید حیرت انگیز معلوم ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۱۲ء سے لے کر اب تک مراکش کے کسی سلطان نے کبھی کسی اور حکومت کے نمائندے سے بات چیت نہیں کی تھی۔ ماسوا اس کے کہ فرانسیسی حکام موجود ہوں اور کڑی نگرانی قائم رکھیں۔ اس کی

وجہ یہ تھی کہ ۱۹۱۲ء سے فرانس نے مراکش کی وزارت خارجہ کے فرائض خود سنبھال رکھے تھے اور یہ بات فرانس والوں کو ناگوار تھی کہ سلطان خارجی پالیسی میں دخل دے۔

سلطان مراکش اور صدر امریکہ کے درمیان کیا بات چیت ہوئی، یہ معلوم نہ ہو سکا فرانس والے کہتے ہیں کہ صدر امریکہ نے سلطان کو مطلع کیا کہ آخر مراکش کو ایک دن آزاد ہونا ہے۔ یہی بات اس خط میں بھی دہرائی گئی تھی جو صدر امریکہ نے سلطان کو ہائیڈ پارک سے لکھا تھا۔

جب ۱۹۴۵ء میں مجلس اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا تو مراکش کے قوم پرستوں کو اور بھی تقویت پہنچی۔ اقوام متحدہ کے منشور میں اس بات کی تصریح کر دی گئی تھی کہ مجلس کے ارکان یہ تسلیم کرتے ہیں کہ تمام قوموں کو آزادی کا حق حاصل ہے اور ہر قوم کے حقوق مساوی ہیں۔ مجلس کے ان ارکان میں جنہوں نے منشور جاری کیا تھا مصر، سعودی عرب، شام اور دوسرے عرب ممالک بھی شامل تھے، یہی وہ ممالک ہیں، جو مستقبل میں عرب بلاک کے موسس ہونے والے تھے اور جنہیں تمام عربوں کے مفاد کا تحفظ کرنا تھا یعنی عربوں کو آزادی کا حق دلوانا تھا۔

اس بین الاقوامی ماحول سے فرانسیسیوں کے بقول سلطان محمد کے غور و فکر کا انداز ہی بدل گیا۔ فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کے اشاروں پر چلنا، گویا سلطان کے لئے ناممکن ہو گیا۔ اگرچہ یہ بات تو نہیں تھی کہ سلطان کٹر قوم پرست بن گیا تھا لیکن وہ یہ ضرور چاہتا تھا کہ مراکش اور فرانس کے درمیان تعلقات کی نوعیت بدل جائے اور دونوں حکومت میں شریک ہو جائیں۔ اس کا کہنا تھا کہ آخرکار مراکش کو آزاد تو ہونا ہی ہے لیکن وہ چاہتا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے فرانس

کے مفاد کو نقصان پہنچے۔ علاوہ ازیں وہ اس بات پر بھی رضامند تھا کہ آزادی کے سال یا تاریخ کا تعین فرانس ہی کر دے۔

فرانس کے آزاد خیال لوگوں کا موقف معقول معلوم ہوتا تھا لیکن بہت سے فرانس کے لوگ ایسے بھی تھے جن کو یہ بات ناگوار گزری۔ فرانس کی حکومت نے بھی انہی لوگوں کی طرح، سلطان کے موقف کو غلط سمجھ کر یہ فیصلہ کیا کہ مراکش کے معاملے میں کسی طرح کی نرمی نہیں برتی جائیگی اور اگر ضرورت پڑی تو فوجی طاقت سے اس ملک کی تحریکِ آزادی کو کچل کر رکھ دیا جائیگا۔

مراکش کے فرانسیسی آبادکار حکومت کی اس پالیسی کے حامی تھے۔ بنک، کارخانہ اور کارخانہ دار بھی، جن کا روپیہ مراکش میں لگا تھا، ان کے ہمنوا تھے۔ پھر کئی بربر قائد اور شیوخ بھی حکومت کی تائید کرتے تھے کہ وہ (فرانس والوں سے بھی کچھ زیادہ ہی) عرب قوم پرستوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان تمام لوگوں نے سلطان محمد کو سب سے خطرناک انقلاب پسند تصور کیا کہ وہ ان کی نظر میں عربوں کی تحریکِ آزادی کی علامت بن گیا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس نے نسبتاً بے باکانہ حقِ آزادی کے تسلیم کئے جانے کا مطالبہ کیا تھا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ اب یہ لوگ سلطان محمد پنجم کو مراکش کی قوم پرست جماعت "استقلال" ہی کیطرح خطرناک تصور کرنے لگے تھے۔

استقلال

سنہ ۱۹۵۰ء میں "استقلال" پارٹی مراکش میں بہت زور پکڑ گئی۔ اس کے ارکان کی اکثریت عربوں پر مشتمل تھی۔ شہروں اور بڑے بڑے قصبوں میں، خاص طور پر مزدوروں میں، اسے بہت مقبولیت حاصل تھی۔ طبعاً اس جماعت کا اثر ان علاقوں میں بھی محسوس کیا گیا، جہاں بربر زن

کی اکثریت تھی۔ اگرچہ غلاوی، جو فرانسیسیوں کا پرانا حلیف تھا، اس تحریک اور اس جماعت کا سخت مخالف تھا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ استقلال پارٹی کا موقف اصلاً کیا تھا کیونکہ اس کے ارکان کے سیاسی عقائد مختلف تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو اس پر قانع تھے کہ عربوں کو سرکاری عہدوں پر فائز کیا جائے اور وہ انتہا پسند بھی جو مراکش کی مکمل آزادی کے خواہاں تھے۔ اگر فرانس والے اعتدال پسند جماعتوں کی بات پر دھیان دیتے تو صورتِ حالات بگڑنے نہ پاتی لیکن وہ تو اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ فرانس سے کوئی سمجھوتا نہ کیا جائے اور اس پالیسی پر اس سختی سے کاربند تھے کہ انھوں نے "استقلال" کو ایک سیاسی جماعت تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ جب یہ جماعت خلافِ قانون قرار دی گئی تو اُن لوگوں کو بھی ناگوار گزرا جو اس سے پہلے بہ ہمہ وجوہ فرانس کیساتھ تھے۔

البتہ فرانس نے استقلال پارٹی کے سیاسی وجود کو یوں تسلیم کیا کہ اس جماعت کے راہنماؤں کو پکڑ کر جیل میں بند کر دیا یا جلا وطن کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ استقلال نے جس تحریک کو جنم دیا تھا اس کی فعالیت کے سررشتے اِن لوگوں کے ہاتھوں میں چلے گئے جو دوسرے ملکوں میں مقیم تھے کہ انھیں دلیس نکالا دیدیا گیا تھا۔

اِن راہنماؤں میں دو زیادہ نمایاں ہیں یعنی الہ الفیصل اور حاجی احمد بلافرج۔ انہی دونوں نے استقلال کی تحریک کو پروان چڑھایا اور اقوام متحدہ کے ذریعے دوسرے ممالک کو مراکش کے کوائف سے باخبر رکھا۔

فرانسیسی، الفیصل کو زیادہ خطرناک تصور کرتے تھے۔ اس کا پیشہ درس و تدریس تھا۔ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے ہی اسے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ قاہرہ میں

وہ مقیم ہوگیا۔ جہاں لوگوں نے ہر طرح سے اس کی اعانت کی۔ دوسرے عرب ممالک نے بھی بڑھ چڑھ کر حمایت کی۔

حاجی احمد نسبتاً اعتدال پسند تھا۔ وہ بھی آزادی کا طالب تھا لیکن انقلاب پسند نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ فرانس اور مراکش میں جو ۱۹۱۲ء سے اس ملک پر قابض تھا دوستانہ روابط قائم رہیں اور مراکش کو آزادی بھی مل جائے۔

شمالی افریقہ کے اکثر سیاسی رہنماؤں نے فرانس میں تعلیم حاصل کی تھی چنانچہ حاجی احمد بھی فرانس گیا تھا۔ یہاں ۱۹۲۸ء میں اس نے "شمالی افریقہ کے مسلمان طلباء کی جماعت" قائم کر دی۔ فرانس کے حکام نے خوف زدہ ہو کر احمد کو فرانس سے نکال دیا۔ یہ واقعہ دوسری جنگ عظیم کے آغاز سے پہلے کا ہے۔ فرانس سے جب وہ وطن لوٹا اور "استقلال" کا معتمد عمومی مقرر ہوگیا تو اسے پھر وطن سے نکالا دیا گیا اور اب کے اسے کارسیکا بھیج دیا گیا۔ چند برسوں کے بعد وہ پھر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگا۔ کبھی میڈرڈ جاتا، کبھی نیویارک جہاں مراکش کے قوم پرستوں نے خوب پاؤں جما لیے تھے اور وہ اقوام متحدہ کے ادارے کے ذریعے مراکش کے کوائف عام لوگوں تک پہنچاتے تھے۔

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ فرانس نے اس مرحلہ پر پے در پے بے تدبیری سے کام لیا۔ چنانچہ استقلال نے اپنی شکایت کی ایک طویل فہرست مرتب کی، جس کی اہم شقیں یہ تھیں۔

(۱) مراکش کی حکومت میں، مراکش کے لوگوں کو مطلقاً دخل نہیں ہے۔

(۲) مراکش کے لوگوں کی شہری آزادی صفر کے برابر ہے۔ انہیں بے قصور بھی

گرفتار کر لیا جاتا ہے مثلاً اس لئے کہ فلاں مقرر کی تقریر سُن رہے تھے، استقلال کا شائع کردہ رسالہ پڑھ رہے تھے یا ایک شہر سے دوسرے شہر سرکاری اجازت کے بغیر جا رہے تھے یہی نہیں بلکہ فردِ جرم عائد کئے بغیر، عدالت کے روبرو پیش کئے بغیر، انہیں جب تک اربابِ اختیار کا جی چاہے قید رکھا جاتا ہے۔

(۳) پینتالیس ہزار سرکاری ملازموں میں سے صرف ساٹھ مراکش کے رہنے والے ہیں۔ باقی تمام فرانسیسی ہیں۔ یہ ساٹھ مراکشی بھی بہت معمولی درجہ کے ملازمین ہیں مثلاً دربان، موٹر صاف کرنے والے، معمولی درجے کا کلرک۔ گویا مراکشیوں کو یہ موقع ہی نہیں ملتا کہ حکومت کرنے کا فن سکھیں۔ اس لئے فرانس والے ہمیشہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مراکشی اپنے ملک کو سنبھالنے کے اہل ہی نہیں ہیں۔

(۴) فرانسیسیوں کے تمام کے تمام بچے مدرسوں میں تعلیم پاتے ہیں لیکن بیس لاکھ مراکشیوں میں سے صرف دو لاکھ بچے ایسے خوش نصیب ہیں جنہیں تعلیم کے حصول کا موقع ملتا ہے۔ ہائی سکول تک صرف پندرہ ہزار مراکشی بچے پہنچ سکتے ہیں اور یونیورسٹی تک صرف تین سو پچاس۔

(۵) مراکش کے لوگوں سے جو ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اس میں سے فرانس کے ان سپاہیوں کو تنخواہ دیجاتی ہے جو قوم پرست مراکشیوں کو کچلنے پر مامور ہیں۔

(۶) ملک کی بہترین قابلِ زراعت زمین کا دسواں حصہ مالدار آبادکاروں کی ملکیت ہے۔ باقی ماندہ زمین کا خاصہ حصہ بھی آبادکاروں ہی کے قبضے میں ہے۔ لاکھوں مراکشی ایسے ہیں جو بسوہ بھر زمین کے مالک بھی نہیں۔

(۷) مراکش کی معدنیات بھی بیشتر فرانس کے تصرف میں ہیں مثلاً لوہا، کوئلہ

مینگنیز، سکہ، زنک، تانبہ، کوبالٹ اور تیل کا ایک چشمہ (فرانس والوں کا خیال تھا کہ اور چشمے بھی دریافت ہوں گے)۔

مراکش کی حکومت فاسفیٹ کے خزینوں پہ قابض ہے (اس معاملہ میں مراکش ہی ایک ایسا ملک ہے جو اس کا مقابلہ کر سکے) کپڑے کے کارخانے، جہاز بنانے کے کارخانے، مچھلی پکڑنے کے لئے کشتیوں کے بیڑے، پن بجلی کے صدر مقامات، فرانس کے تصرف میں ہیں اور یہاں جو مراکشی ملازم ہیں ان کو بہت کم تنخواہ ملتی ہے۔

(۸) فرانس مراکشی مزدوروں کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی یونین قائم کریں، انہیں صرف فرانسیسی یونینوں میں شامل ہونے کی اجازت ہے فرانس کو شاید یہ اندیشہ ہے کہ مراکشی یونینیں قوم پرست عربوں کی تحریک کا مرکز بن جائیں گی۔

(۹) مراکش کی آزادی تو ایک طرف فرانس تو ابھی اس پہ بھی رضامند نہیں ہے کہ مستقبل ہی میں اس ملک کی "حفاظت" سے دست بردار ہو جائے حالانکہ امریکہ نے جزائر فلپائن کو اور انگلستان نے ہندوستان کو آزاد کر دیا ہے مراکش والوں کو اب یقین ہو گیا ہے کہ جب تک وہ زور بازو سے آزادی حاصل نہ کریں گے۔ فرانس انہیں اپنا غلام بنائے رکھے گا۔

۱۹۵۰ء کے بعد مراکش کے قوم پرستوں کی تحریک آزادی آخر کار انقلاب کے مرحلے طے کرنے لگی۔ کبھی ہڑتال، کہیں آتش زنی اور تخریب، کہیں بلوے کہیں خون ریزی اور فساد۔ مختصر یہ ہے کہ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔

۱۹۵۰ء میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کا قومی تحریک پہ گہرا اثر پڑا اور

یہ تھا کہ غلاوی سلطان سے ملاقات کرنے رباط پہنچا اور اپنے ساتھ سات لاکھ فرانک بھی لے کر آیا کہ سلطان کی خدمت میں معمولاً ہدیۃً پیش کئے جانے تھے۔ اس ملاقات کے دوران میں اس نے سلطان سے جو باتیں کیں وہ معمول کے خلاف تھیں۔ غلاوی ان شیوخ میں سے تھا جو سلطان پر یہ الزام دھرتے تھے کہ قوم پرست "اراذل" کو شہ دیتا ہے۔ اس موقع پر اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ "بربری علاقوں میں جو ہنگامہ برپا ہے سلطان پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور سلطان کو اپنی حرکات پر شرم آنی چاہیئے"۔

سلطان کو طبعاً سخت غصہ آیا۔ جو لوگ وہاں موجود تھے ان کا بیان ہے کہ سلطان نے کہا "دور ہو جا کتے"۔ اور غلاوی اٹھ کر چلا گیا لیکن سالانہ ہدیہ بھی اپنے ساتھ واپس لے گیا۔

اس واقعہ کے بعد کاسابلانکا میں، اور دوسرے شہروں میں یکے بعد دیگرے فساد شروع ہو گئے۔ فرانس کی فوجوں اور پولیس کے سپاہیوں نے ہزاروں قوم پرستوں کو ڈھیر کر دیا۔ مراکش کے قوم پرستوں کا بیان ہے کہ بارہ سو آٹھ قوم پرست مارے گئے۔ اس واقعہ کے بعد فرانسیسی حکام نے اور بھی سختی شروع کر دی چنانچہ ایک ہزار رہنماؤں کو جلاوطن کر دیا گیا اور بعض لوگوں کو صحرا میں ان فوجی کیمپوں میں قید کر دیا گیا، جہاں قیدیوں پر خصوصی سختی کی جاتی ہے۔ استقلال پارٹی کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا گیا۔

اگست ۱۹۵۳ء میں واقعات نے نیا رُخ اختیار کیا کہ بحرانی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ غلاوی اپنی فوج لے کر، جس کے پاس پرانے وقتوں کی بندوقیں تھیں، رباط پر چڑھ آیا اور سلطان کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ اس سے پہلے بھی غلاوی

نے اسی طرح ڈرامائی انداز میں سلطان کو زک دینا چاہی تھی لیکن اس وقت فرانس کو تامل تھا اور سلطان کو تخت سے اتار دینے کا انقلاب آفریں قدم اٹھانے سے ہچکچاتا تھا لیکن اس موقع پر فرانسیسی ایجنٹ جنرل نے غلاوی کے حملے سے ماحول سازگار سمجھ کر پیرس سے مناسب احکام حاصل کر لئے اور خود بھی سلطان کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ بہانہ یہ بنایا گیا کہ سلطان کے جان و مال کی حفاظت مقصود ہے۔ اس کے بعد وہی ہوا جو ۱۹۱۱ء میں ہوا تھا۔ فرانس نے سلطان کی حفاظت کی قیمت طلب کی (کہ بربروں کے حملے سے اسے بچایا گیا ہے) چنانچہ سلطان نے مجبوراً نئے فرمان جاری کئے جنکی رو سے اسکے اختیارات بھی محدود کر دیئے گئے

اس سیاسی ماحول میں سلطان کے فرمان کے ذریعہ استقلال پارٹی کو خلاف قانون قرار دیا گیا اور جو طاقتور راہنما اس کی مدد کر سکتے تھے وہ یا جیل میں بھیج دیئے گئے یا جلا وطن کر دیئے گئے۔ اس صورت حالات میں مراکش کو منظم اعانت کی کوئی امید نہ تھی۔ سلطان کی اس شکست اور بے بسی کے باوجود غلاوی اور فرانس کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا اور اس بربری شیخ نے فرانس کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ محمد پنجم کو معزول کر دیا جائے۔ چنانچہ ۲۰ اگست ۱۹۵۲ء کو فرانس کے حکام نے پہلے سلطان کو کارسیکا بھیج دیا اور پھر افریقہ کے دور افتادہ جزیرے مدغاسکر میں نظر بند کر دیا۔

یوں وہ شخص جو نہ انقلاب پسند تھا اور نہ اس کے سوا کچھ چاہتا تھا کہ مراکش اور فرانس میں باعزت سمجھوتا ہو جائے، ایکا یکی مراکش کی جنگ آزادی کی زندہ علامت بن گیا اور اب کانٹے کی تول لڑائی ٹھن گئی۔

قومی تحریک کا نیا دور

محمد پنجم کی معزولی کے بعد اسی دن فرانسیسی حکام نے ایک بوڑھے کو مراکش کے تخت پر بٹھا دیا (علماء نے مجبوراً اس کاروائی کی تائید کی) نیا فرمانروا فرانسیسی حکام کے خیال میں اس قابل نہ تھا کہ قوم پرستوں کی جدید تحریک سے متاثر ہو سکتا۔ وہ نرم دل اور صلح کل انسان تھا۔ دراصل یہ غلادی کا ہی انتخاب تھا۔ نیا سلطان اس کے اقربا میں سے تھا اور فرانس کا حامی۔ مناسب یہ ہے کہ اسے محمد ششم کے لقب سے یاد کیا جائے اگرچہ اس کا پورا نام سیدی محمد بن مولائی ارفع الالہی تھا۔

سلطان محمد ششم کی حکومت دو سال تک قائم رہی۔

اس مدت میں فرانسیسی مراکش میں اصلاحات رائج کرنے کے متعلق زبانی جمع خرچ سے کام لیتے رہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اب مراکش کے لوگوں کو سرکاری عہدوں پر فائز کیا جائے گا اور روزمرہ کی زندگی میں زیادہ آزادی ہو جائے گی جس شخص نے ان اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے کی پوری کوشش کی وہ پیرے مینڈیز فرانس (PIERE MENDES FRANCE) نامی فرانس کا وزیر اعظم تھا کہ بات کا سچا اور دھن کا پکا تھا۔ اس کی حکومت ۱۹۵۴ء میں برسر اقتدار آئی تھی۔

جب پیرے مینڈیز فرانس نے عنان اختیار سنبھالی تو صورت یہ تھی کہ فرانس کو ایشیا میں شکست فاش اٹھانی پڑی تھی کہ پوری فوجی طاقت استعمال کرنے کے باوجود ہند چینی کی نوآبادی ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ مینڈیز فرانس کو یقین تھا کہ شمالی افریقہ کو بھی بزور شمشیر مسخر نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ مراکش کو ہوم رول دیدیا جائے یعنی داخلی امور میں اُسے پوری آزادی حاصل ہو۔ البتہ وزارت

خارجہ کے فرائض فرانس سرانجام دے۔ دفاع بھی فرانس ہی کے ذمے ہے اور دونوں ملکوں میں اقتصادی روابط نہایت خوشگوار ہو جائیں۔

لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ جو لوگ مراکشی قوم پرستوں کے مخالف تھے، انہوں نے مبندرے فرانس کی مخالفت شروع کر دی۔ ان لوگوں نے شور مچایا کہ عربوں کو حکومت کرنا آتا ہی کہاں ہے کہ یہ ذمہ داری انہیں دی جائے۔ مجبوراً مبندرے فرانس مستعفی ہو گیا۔ چنانچہ سمجھوتے اور اصلاحات کے نفاذ کے تمام امکانات ختم ہو گئے۔

جونہی فرانسیسی حکام قوم پرست رہنماؤں کو گرفتار کرتے تھے، دوسرے ان کی جگہ لینے کے لئے سامنے آجاتے تھے۔ یہ لوگ بوڑھے سلطان سے سخت خفا تھے۔ اور وہ دو بار ان کے ہاتھوں سے مرتے مرتے بچا۔ اب حالت یہ ہو گئی کہ مراکش میں فرانس کی فوجیں بھی امن قائم نہ رکھ سکتی تھیں۔ ہر وقت بلوہ یا فساد ہوتا رہتا تھا جب لوگوں نے محمد پنجم کی جلاوطنی کی دوسری سالگرہ منائی تو تین دن تک کشت و خون کا بازار گرم رہا۔ گاؤں کے گاؤں جلا دیئے گئے یا لوٹ لئے گئے۔ فاسفیٹ کا ایک کارخانہ برباد کر دیا گیا۔ اس ہنگامے میں تین سو انسانوں کی جان گئی۔ اس ہنگامے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اقوامِ بربر نے بھی فرانس کی مخالفت کی اور اس ہنگامے میں حصہ لیا۔ اب حکام پر یہ بات واضح ہو گئی کہ اقوامِ بربر کو عرب قوم پرستوں کے خلاف ورغلا کر الجھے ہوئے معاملات کو سلجھایا نہیں جا سکتا۔ لطف یہ تھا کہ اب غلاوی بھی اپنے ہم قوموں کو قابو میں رکھنے سے عاجز تھا۔

آخرکار جب ایک نیا فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل مقرر ہوا تو اس نے فرانس کو بے آبروئی سے بچانے کے لئے یہ تجویز پیش کی کہ سلطان کی جگہ مشیران سلطنت

کی ایک مختصر سی جماعت کو تمام اختیارات سونپ دیئے جائیں کہ مراکش کو ہوم رول دینے کا منصوبہ تیار کرے۔

یہ تجویز سرکاری طور پر منظور ہو گئی۔ استقلال پارٹی کے جلاوطن ارکان نے تعاون پر آمادگی کا اظہار کیا لیکن عملاً کچھ نہ ہوا۔ روز کے بلوے اور خون ریزی جاری رہی اور حکام متذبذب رہے۔ وہ اب تک یہی خواب دیکھ رہے تھے کہ غلاوی لوگوں کو پھر پھسلائے گا اور یہ بلا سر سے ٹل جائے گی۔

۱۹۵۵ء تھا۔ اکتوبر کی ۲۵ تاریخ تھی کہ غلاوی نے ایک حیرت انگیز اقدام کیا۔ ۸۴ سال کے اس بوڑھے شیخ نے اسی سلطان محمد پنجم کو تخت نشین کرنے کی تجویز پیش کی جس کا وہ سخت دشمن تھا اور جس کو جلاوطن کرنے میں اسکا بھی ہاتھ تھا۔

غلاوی کا یہ اقدام اتنا انقلاب آفریں، غیر متوقع اور حیرت انگیز تھا کہ قوم پرستوں کے دشمنوں پر ایک بجلی گر پڑی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بوڑھا بربر اب معترف تھا کہ قوم پرستوں کو دبانا ناممکن ہے۔ اب شیران سلطنت کی تجویز داستان پارینہ ہو گئی۔ حکام کو محسوس ہو گیا کہ وہ بربروں کو ساتھ ملا کر مراکش کا حق آزادی نہیں چھین سکتے۔ یہ بات واضح ہو گئی کہ اب مراکش ہوم رول پر قانع نہیں ہو گا بلکہ کاملاً آزاد ہو کے رہے گا۔

سینے پر پتھر رکھ کر حکام نے زہر کا یہ گھونٹ پی لیا۔ مڈغاسکر سے جلاوطن سلطان ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اپنے وطن پہنچا اور بڑے ڈرامائی انداز میں غلاوی سے ملا۔

۹ نومبر ۱۹۵۵ء کا دن تھا کہ غلاوی سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور دو زانو ہو گیا اور اسی طرح گھسٹتا ہوا تخت کے پائے تک پہنچا کہ سلطان کے گوشۂ عبا کا بوسہ لے۔

یہ وہی غلاوی تھا جس نے دو سال پہلے سلطان کو معزول کرایا تھا۔

جب اس بوڑھے اور خود سر بربری شیخ نے بکمال عجز و نیاز کہا۔ "سلطان ذی شان! یہ حقیر آپ کا غلام پر تقصیر ہے"۔ تو نامہ نگاروں نے اس منظر کی تصویریں لیں۔

سلطان نے کہا۔ "ماضی پر خاک ڈالو کہ صرف مستقبل کو اہمیت حاصل ہے"۔

یوں ۲ مارچ ۱۹۵۶ء کو ۴۴ سال کے عہد غلامی کے بعد فرانس اور مراکش کی دولتِ شریفیہ کے درمیان ایک نیا معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کے ذریعے مراکش کو خود مختار تسلیم کیا گیا۔ دوسرے مہینے ہسپانیہ نے بھی قوم پرستوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور ہسپانوی مراکش بھی نئی ریاست کا جزو بن گیا۔ واضح ہو کہ یہ گفت و شنید مراکش کے نئے وزیر خارجہ نے کی یعنی حاجی احمد نے جو نیویارک میں جلاوطنی کے دن گزارنے کے بعد وطن لوٹ آیا تھا۔ اس کے بعد طنجہ بھی مراکش کا جزو قرار دیا گیا۔

نومبر ۱۹۵۶ء میں مراکش نے ایک آزاد رکن کی حیثیت سے مجلس اقوام متحدہ میں شرکت کی اور اب تمام دنیا کو معلوم ہو گیا کہ مراکش آزاد ہو چکا ہے۔

مراکش کا مستقبل

اب جبکہ مراکش آزاد ہو چکا ہے اہلِ مراکش اس حقیقت سے آگاہ ہو رہے ہیں کہ حصولِ آزادی کسی ملک کی ترقی کی منزل نہیں بلکہ نشانِ منزل ہے۔ اپنے ملک پر خود حکومت کرنے کے حق کے ساتھ ان کے کندھوں پر یہ ذمہ داری بھی آپڑی ہے کہ ملک مسلسل ترقی کرتا رہے اور عوام خوشحال رہیں۔ اب تمام مسائل ــــ اقتصادی، سیاسی، تعلیمی، انتظامی ــــ خود مراکش والوں ہی کو حل کرنے ہیں۔

نئے سلطان کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ اب فرانس اور مراکش کے درمیان روابط کی نوعیت کیا ہو کہ دونوں ملک باعزت طریقے سے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھا سکیں۔

مراکش اور فرانس کے پچھلے اختلافات کے پیشِ نظر یہ بات شاید عجیب معلوم ہو کہ مراکشی فرانس سے اچھے روابط رکھنا چاہتے ہیں لیکن بات دراصل یہ ہے کہ مراکش والے یہ سمجھتے ہیں کہ اگر مراکش کو فرانسیسی اعانت نہ ملی تو اس کا مستقبل مخدوش ہوگا دوسری طرف فرانس بھی اچھے روابط قائم رکھنا چاہتا ہے کیونکہ اس نے مراکش میں اتنا روپیہ پھیلا رکھا ہے کہ اس کا مراکش سے قطع تعلق عملاً ناممکن اور مضرت رساں ہے۔

مراکش کو اقتصادی اعانت کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ ملک میں معدنیات یا قابلِ کاشت زمین کی کمی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مراکشیوں کے پاس اتنی دولت نہیں کہ وہ ان کانوں، کارخانوں اور مزروعہ زمینوں کو خرید سکیں جو فرانسیسیوں کی ملکیت ہیں۔ ایسا ممکن بھی ہو جائے تو مراکش کے لوگ وہ فنی مہارت نہیں رکھتے جو ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے۔ غرض فرانس اور مراکش دونوں کو احساس تھا کہ اگر ان کے تعلقات منقطع ہو گئے تو فریقین کو نقصان ہوگا۔ ان سب باتوں پر غور وفکر کرنے کے بعد دونوں ملکوں نے ایک دوسرے سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنا ہی مناسب خیال کیا۔

ملکی انتظام، مدارس کی تعمیر، مکانات بنانے کے منصوبے، صحت عامہ کی بہتری کے اقدامات، ان تمام چیزوں میں مراکش فرانس کا محتاج ہے۔ ہزاروں فرانسیسی مراکشی حکومت کے ملازم ہیں اور ان کے بغیر انتظام کی بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ دونوں ملکوں کے درمیان گفت وشنید میں یہ باتیں فرانس کا پلہ بھاری رکھتی ہیں۔ آزاد مراکش میں سیاسی حالات کی پیچیدگی بھی اس کو فرانس سے منقطع نہیں ہونے دیتی۔ مراکش کے تمام لوگ محمد پنجم کے وفادار ہیں لیکن اس کے سوا ہر معاملے

باہمی اختلاف ہے۔ پرانے امرا نئی تبدیلی سے بالکل نہیں بدلے اور اب تک وہ پچھلے زمانے کو یاد کرتے ہیں۔ وہ جان توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ انہیں پچھلی مراعات حاصل رہیں۔ آبادکار اقوام بربر اور عربوں کے اختلافات کو شہ دے رہی ہیں تاکہ پھر فرانس کو مراکش پر تسلط قائم کرنے کا موقع مل سکے۔ مراکش کی سب سے طاقتور سیاسی جماعت استقلال کے رہنما چاہتے ہیں کہ امرا یعنی پاشاؤں اور قائدوں کے پاس جو زرعی زمین ہے وہ مراکش کے غریب کاشتکاروں میں تقسیم کر دی جائے۔

استقلال کے ارکان بھی گروہوں میں منقسم ہیں۔ اعتدال پسند فرانس سے تعاون کے طالب ہیں۔ انتہا پسند فرانس ہی سے نہیں، مغرب کے اثر اور اس کی تہذیب سے یکسر چھٹکارا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ عرب بلاک کی روزافزوں طاقت کا سہارا لیتے ہیں۔ انہوں نے مشرق وسطیٰ کی عرب ریاستوں کی طرح یہودیوں کے خلاف ایک تحریک شروع کر دی ہے۔ اگر اس تحریک کی وجہ سے یہودی مراکش سے یکسر ہجرت کر گئے تو ملک میں ماہر پیشہ وروں کی بہت کمی ہو جائیگی غالباً یہی سوچ کر سلطان مراکش نے اعلان کیا ہے کہ یہودیوں سے آئندہ مراکش میں اچھا سلوک کیا جائے گا۔

محمد پنجم میانہ روی کا قائل ہے اور فرانس سے تعاون کا طالب ہے لیکن اسے توقع ہے کہ فرانس افریقہ کی نوآبادیوں سے ایک دن دستبردار ہو جائے گا وہ ریاستہائے متحدہ امریکہ سے بھی خوشگوار روابط قائم رکھنا چاہتا ہے اور مزدوروں کی اجرت بڑھانا اور مراکشی کاشتکاروں کا معیار زندگی بلند کرنا چاہتا ہے، لیکن وہ اصلاً اکابرِ ملک کی جماعت کا فرد ہے، اس لئے اصلاحات تیزی سے نافذ نہیں کر

سکتا اور اس پر آمادہ نہیں ہو سکتا کہ مراکش کے با ثروت جاگیرداروں کی جاگیریں کم و بیش بھی چھین لی جائیں۔

سلطان محمد پنجم ملک میں جمہوریت کو فروغ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ مطلق العنان فرماں روا ہونے کی بجائے جمہوری ریاست کا آئینی حاکم ہونا چاہتا ہے۔ اسے سلطان کے روایتی لقب کی بجائے بادشاہ کا لقب پسند ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کو اپنا جانشین نامزد کر کے علما کی قائم کردہ پرانی روایات کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس نے جمہوری طریقوں کے مطابق ملک کے نمایندوں کی ایک ایسی مجلس کے قیام کی منظوری دی ہے جس میں ہر قسم کا سیاسی عقیدہ رکھنے والے لوگ شریک ہوں گے۔ اس نے کہا ہے کہ مراکش میں صحیح معنی میں جمہوریت قائم ہونی چاہیئے اور ایک ایسا آئین نافذ ہونا چاہیئے جو مراکش کے عام باشندوں کو مساوی حقوق عطا کرے اور انصاف کا ضامن ہو۔ ظاہر ہے کہ مراکش کے لوگ اپنے ووٹ کا صحیح استعمال بتدریج ہی سیکھ سکیں گے کہ مکمل آزادی کے لئے سیاسی شعور کی تربیت بہت وقت چاہتی ہے

شاید یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ غلادی —— بوڑھا بربر۔ جنگ آزما۔ آخر ۱۹۵۶ء میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ وہ رات کو بھلا چنگا سویا۔ صبح کو دیکھا تو مر چکا تھا۔

مراکش کے شہر اور مناظر

رباط یعنی مراکش کا دارالسلطنت حکومت کے تمام کاموں کا مرکز و محور ہے۔ اس شہر کے یورپی حصے بس سادہ لیکن دل نشین عمارات واقع ہیں، جہاں کبھی فرانسیسی

ریذیڈنٹ جنرل اور اس کا عملہ سکونت پذیر تھا۔ اس کے کشادہ بازار، خوشنما بنگلے، شوخ رنگ کے پھولوں سے لدے پھندے درخت اور پودے، واشنگٹن کی یاد دلاتے ہیں جو امریکہ کا دارالسلطنت ہے۔

اس سے ذرا فاصلے پر، شاہی محل واقع ہے۔ مراکش کے دوسرے قصرہائے شاہی کی طرح اس کی ظاہری حالت اچھی نہیں ہے کہ باہر سے کچھ غیر محکم اور پرانا سا نظر آتا ہے۔ لیکن اندرونی حصہ مشرقی جاہ و جلال کا مظہر ہے اور جگہ جگہ مختلف رنگوں کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ محل کے عین سامنے ایک کچا میدان ہے، یا اسے صحن کہہ لیجیے جو مراکش کی شاہی عمارات کا جزوِ خاص ہوتا ہے۔ یہاں فوج کی سلامی لی جاتی ہے، تقریبات منعقد ہوتی ہیں، قبیلوں کے شیخ سلطان کے سامنے سرِ نیاز خم کرتے اور ہدیے پیش کرتے ہیں۔

رباط کے باشندے (تقریباً ایک لاکھ ساٹھ ہزار) گوناگوں ہیں۔ ان میں پہاڑی قبائلی بھی ہیں۔ میلی سی قباؤں میں لپٹے ہوئے عرب بھی، زرق برق کپڑوں میں ملبوس فرانسیسی عورتیں بھی، گہرا پردا کرنے والی مسلمان خواتین بھی اور قریب کی چھاؤنیوں کے امریکی سپاہی بھی۔

رباط کے قریب ہی ایک اور شہر واقع ہے یعنی صالی۔ رباط اور صالی کے درمیان بوررج رج نامی دریا پڑتا ہے۔ اس پر جو پُل ہے وہ دونوں شہروں کو ملاتا ہے لیکن ایک پرانی کہاوت چلی آتی ہے کہ ان دو شہروں کے باشندوں کے دل اس وقت تک نہیں مل سکتے جب تک ریت کے ذرّے میوہ اور پانی دودھ نہ بن جائیں۔ صالی میں صرف عرب آباد ہیں اور یوں کہنا چاہیے کہ مراکش کے دانشوروں

ہیں جو لوگ زیادہ ترقّی پسند ہیں ان کا غیر سرکاری صدر مقام یہی شہر ہے۔

فیض۔ ایک رومانی شہر

فیض کو دنیا کے ان شہروں میں شمار کیا جاتا ہے جہاں رومان چپّے چپّے سے جیسے اُبلا پڑتا ہے۔ اس شہر کی گلیاں تنگ اور پیچدار ہیں۔ عمارتوں کا رنگ سیاہ، سپید یا گہرا سُرمئی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ شہر بیرونی دنیا سے بالکل الگ تھلگ واقع ہے اور اس کی حقیقت دنیا کی نظروں سے اوجھل ہے۔ اسی لئے کچھ خوفناک سا معلوم ہوتا ہے لیکن شہر کے اندر جائیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہری بھری وادیاں ہیں جنہیں نہریں اور چشمے سیراب کرتے ہیں۔ انہی وادیوں میں مراکش کے فنکاروں، دانشوروں اور مفکروں نے جنم لیا ہے اور پروان چڑھے ہیں۔

فرانسیسیوں کے وُرود کے بعد جو حصہ بنا ہے اس سے قطع نظر بازار کم و بیش اتنے تنگ ہیں کہ موٹر تو ایک طرف بائیسکل بھی مشکل سے گزر سکتی ہے بازاروں کے ایک طرف باغ ہیں۔ دوسری طرف گھر۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بازار کیا ہیں گلیارے ہیں۔ کہیں بازاروں کے حصّے زینوں اور سیڑھیوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ان کی تعمیر میں اکثر گارا اور کنکر استعمال ہوتا ہے۔ دھوپ سے بچنے کے لئے کہیں لوگ ان پر دریاں اور پردے ڈال لیتے ہیں۔ اور کہیں ان پر بیلیں چڑھا دیتے ہیں۔

اِس شہر کا بازار (سُوق) البا رنگین ہے کہ میری نظر سے اس کی نظیر نہیں گزری۔ اِن مُسقّف بازاروں سے (جیسے شہر کے اندر شہر آباد ہے)

کوئی چاہے تو ڈی۔ڈی۔ٹی سے لیکر عطریات تک، اور زندہ بکریوں سے لیکر معجون تک خرید سکتا ہے۔ پیشہ وروں کی مصنوعات بھی تمام ملتی ہیں۔ مثلاً غالیچے ظروف، کشیدہ کاری کا کام، کندہ گری کے نمونے (تانبے پر) اور مراکش کا مشہور عالم چمڑا۔ یہ شہر صدیوں سے تجارت کا مرکز رہا ہے اور کبھی یہاں دو سو کارواں سرائیں موجود تھیں جن میں سے ہر ایک میں پانچ سو گھوڑے ...

فیض میں یوں تو ہزاروں مسجدیں ہیں لیکن جامع قیروان بہت مشہور ہے۔ اس سے متعلقہ یونیورسٹی عالمِ اسلام کی مشہور ترین درسگاہوں میں سے ہے۔ یہاں طالب علم ٹھنڈے حجروں میں رہتے ہیں۔ دن میں صرف ایک روٹی کھاتے ہیں اور دن رات تحصیل علم میں بسر کرتے ہیں۔ یہاں جید علما درس دیتے ہیں۔ اکثر طالب علم پھندنے دار بن چھجے کی وہ لال ٹوپی پہنتے ہیں جسے اصطلاح میں اس شہر سے منسوب کرکے "فیض" کہتے ہیں (رومی ٹوپی) یہیں وہ گوندنی اگتی ہے جس سے ان ٹوپیوں کا مخصوص شوخ عنابی رنگ بنایا جاتا ہے۔ اسلامی عنصر کے علاوہ اس شہر میں ہسپانوی عنصر بھی ہے، کہ دو لاکھ کی آبادی میں ان آٹھ ہزار ہسپانوی خاندانوں کی اولاد بھی شامل ہے جو ازمنہ وسطیٰ میں آباد ہوئے تھے۔ یہودیوں کا عنصر بھی نظر آتا ہے جن کی اصل بھی ہسپانوی ہے۔ عموماً یہاں کے لوگ بہت گورے ہوتے ہیں۔ شمالی افریقہ کے پہاڑی علاقوں کے زرد رو بربروں سے بھی زیادہ گورے۔

شہر کے چاروں طرف انگوروں کے باغ ہیں۔ انگوروں کی بیلیں

نتھنوں پر پھیلی ہوئی بہت بھلی لگتی ہیں اور اکثر مالدار سوداگر اور اعلیٰ متوسط طبقے کے لوگ یہاں بستے ہیں۔ اس شہر نے تہذیب و تمدّن کی قریب قریب تمام منزلیں طے کر لی ہیں اسی لئے یہاں کے باشندے جنوب کے بربروں کو ان پڑھ اور غیر متمدّن تصوّر کرتے ہیں۔ علماء بھی کثرت سے ہیں، لیکن مزدوروں کی بھی کثرت ہے جو جاگیر دارانہ نظام کے ماتحت تھوڑی اجرت پر کام کرتے ہیں، اندھے گداگر بھی بہت ملتے ہیں۔ ایک بار آدھی رات کے وقت میں اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ جیسے ڈاک کے تھیلے اوپر تلے دھرے ہوں بعد میں معلوم ہوا کہ غریب عرب اپنی عباؤں میں لپٹے سو رہے ہیں۔

کاسا بلانکا — شمالی افریقہ کا مشہور شہر، رباط مراکش کا واشنگٹن ہے تو کاسا بلانکا نیویارک ہے۔ یہ بندرگاہِ رباط سے ۵۶ میل جنوب کی طرف اوقیانوس کے ساحل پر واقع ہے۔ اس کی آبادی اور رونق روز افزوں ہے دراصل اسے ملک کا تجارتی، اقتصادی اور صنعتی قلب کہنا چاہیئے۔ یہاں آٹھ لاکھ کی آبادی ہے، جو بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ رقبہ میں مراکش کا سب سے بڑا شہر بھی ہے اور شمالی افریقہ کے چار پانچ بڑے شہروں میں اس کا شمار ہے۔

چالیس پچاس سال اُدھر کی بات ہے اس شہر میں ماہی گیروں کی جھونپڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا لیکن آج رونق میں ریو جی ڈینیرو یا میامی کا حریف ہے۔ اس کی سپید عمارتیں، اور ان عمارتوں کے درخشاں شیشے، بہت

دل پذیر ہیں، جدید وضع کی چمکتی ہوئی شہ نشینوں کا رخ اوقیانوس کی طرف ہے۔ یہاں سیاح کو سبھی کچھ ملتا ہے۔ نہایت آرام دہ ہوٹل، پیرس کی وضع کے ریستوران، کشادہ بازار، خوبصورت موٹریں، اعلیٰ درجہ کی دکانیں اور نہانے کا ایک بے نظیر تالاب ہے جس کا شمار دنیا کے بہت بڑے تالابوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ تالاب قریباً ۵۰۰ گز لمبا ہے۔

کاسابلانکا میں پرانا شہر بھی موجود ہے، یہ ساحل سمندر کے قریب ہے۔ اس شہر میں ایک جدید وضع کی بستی بھی ہے جو فرانسیسی طرز پر تعمیر کی گئی ہے۔ اس بستی میں صفائی کا انتظام بہت اچھا ہے مگر شہر کا ایک اور حصہ بھی ہے جہاں لوگ غلیظ جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگ پیٹرول کے خالی ٹینوں کو باہم جوڑ کر اپنے گھروں کی دیواریں بنا لیتے ہیں۔ مراکش کے دوسرے شہروں میں بھی ایسے حصے موجود ہیں کہ آبادی بڑھ گئی ہے اور مکانوں کی کمی ہے۔ کاسابلانکا میں یہ حصہ اتنا غلیظ ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مجھے یہ حصہ دیکھ کر اپنے ملک کا وہ زمانہ یاد آگیا جب اقتصادی بدحالی کے دنوں میں لوگوں کو شہر سے باہر کچے مکان تعمیر کرنے پڑے تھے۔

(۵)

امریکی اڈے

اس وقت مراکش میں پانچ امریکی اڈے ہیں (ہوائی فوج کے پانچویں ڈویژن کے صدر مقام رباط سے قطع نظر) ان اڈوں کو دیکھنے کی ابتدا اگر شہر کاسابلانکا سے کی جائے تو بہت آسانی ہوگی کیونکہ ان میں سے بیشتر کاسابلانکا کے جھلمل جھلمل کرتے شہر کے شمال یا جنوب میں ساحل سمندر کے قریب واقع ہیں۔

۱۹۵۱ء میں جب امریکہ اور روس کے درمیان لڑائی کا خطرہ بہت شدید ہوگیا تھا اور امریکی سپاہی کوریا میں مصروف جنگ تھے۔ اس وقت یہ اڈے تعمیر کئے گئے تھے۔ امریکہ کے فوجی انجنیئروں نے یہ اڈے تعمیر کر کے ایسا معرکے کا کام کیا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی کہ دوسری جنگِ عظیم سے لے کر اب تک کسی بیرونی ملک میں امریکہ نے اس پیمانے پر اپنی تیاریاں مکمل نہیں کی تھیں۔ اس کام میں غیر فوجی ٹھیکیداروں نے بھی ان کی بہت مدد کی۔ یہ کام جلدی میں کیا گیا اس لئے اس میں خامیاں بھی رہ گئیں اور متعلقہ لوگوں پر اسراف، رشوت اور نااہلی کے الزامات بھی لگائے گئے۔

کاسابلانکا سے مراکش جاتے ہوئے میں نواسیر کے اڈے پر اترا۔



یہاں سے دوسرے اڈوں کو مختلف قسم کی رسد اور مرمت کا سامان بھیجا جاتا ہے۔ نواسیر نہ صرف دنیا کا بہت بڑا ہوائی میدان ہے بلکہ ایک شہر بھی ہے۔ اگرچہ اس کی نوک پلک ابھی نہیں نکالی گئی۔ اس ہوائی اڈے کی تعمیر کے وقت چھ ہزار مراکشی خاندانوں کو متبادل جگہ دینا پڑی تھی اور اس ہوائی اڈے کی تعمیر پر کروڑوں روپیہ خرچ ہوا تھا۔

اس اڈے میں ہوائی جہازوں کی مرمت کے لئے جو کارخانے بنائے گئے ہیں، ان کا رقبہ چھ لاکھ مربع فٹ ہے۔ یہاں بیس مشینیں ہیں جن میں سے ہر ایک چھ سو گیلن فی منٹ کے حساب سے ہوائی جہاز میں پٹرول ڈالتی ہے۔ یہاں ایک بہت بڑی دکان ہے کہ ہر قسم کی چیزیں موجود ہیں کسی لمبی لڑائی میں فوج کو یا کسی شہر کو ڈبوں کے گوشت سے لے کر بیجوں اور زنجیروں تک، جس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے، سب یہاں ملتی ہیں شاید آپ کو یہ سن کر اچنبھا ہو کہ میں نے یہاں دس ہزار جہاز بھی دیکھے ہیں۔

ذرا آگے، اسی سڑک پر بین گریر کے مقام پر، ایک اور ہوائی اڈہ ہے یہاں ہوائی جہاز کی اڑان شروع کرنے کے لئے جو میدان تعمیر کیا گیا ہے وہ نیویارک کے سنٹرل پارک کے میدان سے بھی بڑا ہے، مستحکم پتھر پر کٹے ہوئے کنکروں کی وہ تہیں جمائی گئی ہیں یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے سرمئی رنگ کے چاند کی سطح کو ہموار کر دیا گیا ہے۔

مراکش

مراکش کی آبادی تقریباً دو لاکھ چالیس ہزار ہے۔ کاسابلانکا کے بعد اسی شہر کا مقام ہے۔ یوں کہنا

چاہیئے کہ کاسابلانکا کے پروان چڑھنے سے پہلے یہی شہر ملک کا سب سے بڑا شہر تھا۔ یہ بہت قدیم شہر ہے۔ ۱۰۶۲ء سے کہ اسکی تعمیر کا سال ہے، صحرا کے شمال مغرب کے قبیلے اسی کو اپنی تجارت کا مرکز بنانے چلے آئے ہیں۔ شہر کی تعمیر سے پہلے بھی یہاں سے کارواں گزرا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اس کا نام بربری زبان کے ایک کلمے سے مشتق ہے جسکے معنی ہیں "فوراً چلے جاؤ"۔ یہ کلمہ پرانے زمانے میں اس شہر کے نواحی علاقوں میں بہت سنائی دیتا تھا کہ یہاں ڈاکوؤں کی کثرت تھی اس لیے مسافر اس مقام سے تیزی سے گزر کر محفوظ تر مقامات تک پہنچنا چاہتے تھے۔ جب مراکش پروان چڑھنے لگا تو اسکی اہمیت کے پیش نظر نواحی علاقے کو بھی یورپی اقوام نے اسی نام سے پکارا اور ان کی زبان میں یہ کلمہ مراکو ہو گیا۔

مراکش کو مدینۂ احمر بھی کہتے ہیں کہ صحرائے اعظم کا سرخ ریگ اسکے پاؤں چومتا ہے۔ لیکن یہ اپنی پشت پر برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں والے پہاڑ بھی اٹھائے ہوئے ہے اور خود ایک باغ سے مشابہ ہے۔ نارنج کے درخت، سرو، بوگین ویلا کی بیلیں، گلاب کے پودے، کھجور کے درخت یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ تمام چیزیں نقوش تصویری کی طرح کسی نے ورقِ آسمان پر چپکا دی ہیں۔ یہ شہر ہسپانیہ کے شہر سیول سے مشابہ ہے کہ اسکی اکثر عمارتیں اسی ہسپانوی شہر کے معماروں کی تعمیر کردہ ہیں۔ اس کے باوجود مراکش بہ حیثیت مجموعی افریقہ ہی کا شہر معلوم ہوتا ہے

اس کی نبض صحرا کے شہروں کی طرح تپاں اور رواں رہتی ہے۔ بازار فیض کے بازاروں کی طرح پیچ دار اور تنگ نہیں۔ مارکیٹ بھی نسبتاً کشادہ ہے جالیوں یا پردوں میں سے کبھی کبھی تابناک آسمان نظر آجاتا ہے۔

مارکیٹ یا بازار میں وحشی، توانا، زندہ اور شوخ رنگوں کے میلے نظر آتے ہیں۔ یہیں تو ارغ کے قبیلے کے سنار رنگ لوگ، نیلگوں نقاب پہنے اور صحرا کے پچھلے حصوں کے سغالی لوگ، جو دیدۂ کور کی طرح سیاہ ہیں نظر آتے ہیں۔ غرض ہر رنگ روپ کے لوگ موجود ہیں۔ بھورے، برنزہ، چاکلیٹ تارکول، سُرخی مائل بھورے، سرمئی، مہاگنی۔ میں نے بازار میں ایک سفید سرکش توسن دیکھا کہ لٹکا ہوا تھا اور قریب ہی چمڑے کی قبائیں اور چپلیں بھی رکھے تھے، جن کے رنگ شوخ سنہری اور نیلے تھے۔ گویا رنگ فروش نیلے اور سُرخ رنگوں کے چشموں کے پیچھے بیٹھے ہوئے اپنا کاروبار کرتے ہیں۔

یہ بازار زندگی سے لبریز اور گوناگوں کیفیتوں کا حامل، ایک میدان بن گیا ہے بخوب کشادہ، یہ میدان جامع الفنا کہلاتا ہے۔ افریقہ میں یہ مقام دیدنی ہے۔ اسے موت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو ابلتی ہوئی زندگی کی علامت ہے۔ یوں کہیے کہ یہ ایسا مقام ہے جہاں دکانیں بھی ہیں تفریح کا سامان بھی ہے اور دنیوں کی سلامی لینے کے لئے مناسب جگہ بھی جیسے افریقہ میں "کونی آئی لینڈ" عجیب بات یہ ہے کہ گرمیوں میں بھی یہاں دیہاتی بہت سے کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ افلاس کے

کے باعث نہ تو وہ کسی کارواں سرائے میں ٹھہر سکتے ہیں اور نہ فالتو کپڑے رکھنے کے لیئے ان کے پاس کوئی جگہ ہے۔ اس لئے سب کپڑے پہن لیتے ہیں اور اپنے جانوروں کو لے کر چل دیتے ہیں۔

شام کے وقت یہاں بڑی بہار ہوتی ہے کہ ہر تفریح کا ہنگامہ اپنے پورے شباب پر ہوتا ہے۔ کہیں سپیرے ہیں، کہیں شعبدہ باز بیٹھے ہیں، کہیں آگ نگلنے والے ہیں، کہیں داستان گو سننے والوں کو مسحور کیے دیتے ہیں۔ یہیں مجھے ایک بہت دلچسپ منظر دکھائی دیا کہ اندھے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے قطار باندھے ہجوم میں سے گذر جاتے ہیں۔

غلاوی کے ہاں رات کا کھانا

غلاوی جو مراکش کا پاشا تھا۔ مرتے دم تک، یعنی ۱۹۵۶ء تک مراکش ہی میں رہا۔ سچ پوچھئے تو اثر و نفوذ کے لحاظ سے مراکش اس کا دارالسلطنت تھا۔ اسے لوگ اکثر کوہسار اطلس کا مولا کہہ کر پکارتے تھے، خوش قسمتی سے مجھے ایک بار اس کے ہاں دوسرے مہمانوں کے ساتھ ضیافت میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ یہ ضیافت ہمیشہ مجھے یاد رہے گی۔

جب میں دوسرے مہمانوں کے ساتھ پاشا کے محل میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بیس باریش ملازم قطار باندھے کھڑے ہیں۔ وہ ہمیں ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے جہاں صوفوں پہ عنابی دھاریاں تھیں، پردے سبز تھے اور غالیچہ سرخ زرد رنگ کا تھا۔ مسلمانوں کو وہ رنگ

پسند ہیں جو مسل خوردے ہوں۔ دستور ہے کہ سردی کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو تقریبات کے موقعوں پر کھڑکیاں اور دروازے کھلے رکھتے ہیں اس وقت بھی کھڑکیاں ، اور دروازے کھلے ہوئے تھے اور کمروں میں ٹھنڈی ہوا آرہی تھی اور پرندے بڑی بے تکلفی سے کمروں میں آجارہے تھے۔

علاوی تنہا مسند پر بیٹھا تھا ، ہمیں دیکھکر وہ تعظیم کے لئے اٹھا اس وقت وہ اپنے جبے کے نیچے امریکی انداز کی قمیض پہنے تھا اور ایک سُرخ ٹائی باندھے ہوئے تھا۔ پاؤں میں چپل اور چوخانی جرابیں پہنے تھا۔ وہ ہم مہمانوں کو ساتھ لے کر صحن سے اس مقام تک گیا جہاں دعوت کا انتظام تھا۔ صحن میں جگہ جگہ نارنگی کے درخت تھے ہم نے دیکھا کہ امریکی انداز کا کاک ٹیل بار کا انتظام ہے جہاں ہر قسم کی شراب موجود ہے۔ اس دعوت میں علاوی اور عرب مہمان شراب سے محترز رہے ، لیکن وہ دوسروں کی شراب نوشی پر معترض بھی نہ تھے۔

اب ایک ملازم آیا اور اس نے مراکشی ملازموں کے مخصوص انداز میں علاوی کی کہنی پکڑ کر ہلائی۔ مراد یہ کہ کھانا تیار ہے۔ ہم باہر گئے۔ ایک اور صحن سے گزر کر اتنے بڑے کمرے میں پہنچے جہاں دو سو آدمی بیٹھ سکتے تھے اس کمرے میں گلابی ، سبز اور ارغوانی رنگ نمایاں تھے ، پاشا مسند پر بیٹھ گیا اور ہم اس کے گرداگرد بیٹھ گئے۔ عربوں کے ہاں ضیافت بڑی ہی دلچسپ تقریب ہوتی ہے لیکن مہمانوں کو خفت ہوتی ہے اگر وہ پہلے سے اِن کے کھانے کے آداب نہ جانتے ہوں۔ بہرحال اِن باتوں کو جان لیجئے کہ کام آئیں گی۔

مہمان گدّوں پر بیٹھتے ہیں ۔ ہر مہمان کے زانوؤں پر ایک بڑا سا سفید نیپکن ڈال دیا جاتا ہے ۔ اس سے انگلیاں تو صاف کی جا سکتی ہیں لیکن منہ نہیں صاف کیا جاتا ۔ خاص تقریبات کے سوا، کانٹے، چھریاں، چمچے، پلیٹیں اور اس قسم کا ساز و سامان سرے سے غائب ہوتا ہے ۔ مہمانوں کے سامنے فرش پر دستر خوان بچھا دیا جاتا ہے ۔ وسط میں بڑے بڑے خوان رکھ دیئے جاتے ہیں اور مہمان ہاتھ سے کھانا کھاتے ہیں ۔ روٹیاں خوب سرخ اور بڑی ہوتی ہیں اور بائیں ہاتھ کی مدد سے توڑی جاتی ہیں اور تمام چیزیں دائیں ہاتھ سے کھائی جاتی ہیں ۔ انگلیاں منہ کو نہیں چھوتیں ۔ یوں سمجھ لیجئے کہ کھانے کے نوالے منہ میں اچھال دیئے جاتے ہیں ۔ کھانے کی چند چیزیں تو اس طرح کھائی جا سکتی ہیں لیکن اگر خوب گرم تلا ہوا انڈہ اس طرح کھانا پڑے تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مہمان پر کیا بیت جائے گی ۔

کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد مہمانوں کے ہاتھ دھلائے جاتے ہیں جب ایک قسم کا کھانا کھایا جا چکتا ہے تو بقایا عورتوں کے حرم میں پہنچا دیئے ہیں ۔ جہاں پہلے بیویاں اور کنیزیں کھاتی ہیں پھر مرد ملازموں اور پلیش خدمتوں کی باری آتی ہے ۔ آخر میں بچا کھچا فقیروں کو دے دیا جاتا ہے جو دروازے پر جمع ہوتے ہیں ۔

ہمیں پہلے خوب میٹھی چائے پلائی گئی کہ یہی دستور ہے اور پھر ضیافت شروع ہوئی ۔

پہلے سبز رنگ کا شوربا آیا ۔ جس میں بادام، مٹر اور سپید مچھلی کے

ٹکڑے تیر رہے تھے۔ مغربی مہمانوں کی خاطر پلیٹیں اور چمچے بھی مہیا کئے گئے تھے اس کے بعد بھنا ہوا بکرا دستر خوان پہ رکھا گیا کہ یہ مرغنیات کا جزو اعظم ہے غلاوی نے بڑے سلیقے سے گوشت کے ٹکڑے کر ڈالے اور لذیذ لذیذ بوٹیاں خود مہمانوں کو پیش کرنے لگا۔ عربوں کے ہاں قاعدہ ہے کہ بڑی بڑی بوٹیاں نہیں کھاتے، بلکہ بڑے سلیقے اور تکلف سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نوش جان کرتے ہیں اور یہ سمجھ میں آنے والی بات بھی ہے کیونکہ اتنی قسم کا کھانا ہوتا ہے کہ آدمی چکھ چکھ کر سیر ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد ہمارے سامنے "پائی" آئی۔ یہ ایک قسم کا انگریزی کھانا ہے جس میں اوپر آٹے کی پیسٹری جمی ہوتی ہے اور اندر گوشت وغیرہ بھرا ہوتا ہے جس کی تیاری میں دو روز صرف ہوتے ہیں اور جس پر مراکش کے ایک اچھے باورچی کو ناز ہوتا ہے۔ اس پائی کا قطر قریباً تین فٹ تھا۔ اس کے اوپر کا حصہ خوب کرارا تھا۔ اندر مچھلیاں، کلیجی کی بوٹیاں، تلے ہوئے انڈے، میٹھے ٹکڑے اور اسی طرح کی کئی چیزیں تھیں۔ اس کے بعد چار قسم کا کھانا آیا۔ پہلے بھنے ہوئے چوزے، اس کے بعد بکرے کے بھنے ہوئے گوشت کی باری آئی، پھر شاہی ٹکڑے لائے گئے۔ مقصد یہ تھا کہ ہماری بھوک پھر چمک اٹھے۔

اس کے بعد وہ کھانا ہمارے سامنے رکھا گیا جو مراکش میں امیر غریب سبھی شوق سے کھاتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ گندم کی ایک اچھی قسم کو کوٹ کر خوب بھون لیتے ہیں، پھر کچھ اور چیزیں ملا کر پکاتے ہیں۔ اس نشاستے

ہیں انگور بھی پڑتے ہیں اور بکرے کا گوشت بھی۔ ہم نے پاشا کے ہاں اس کھانے کی جو صورت دیکھی وہ ذرا مختلف تھی کہ گاجریں، شلجم اور مغزیات بھی لشاستے میں شامل کر دی گئی تھیں۔

جس طرح جاپان میں قاعدہ ہے کہ کھانے کے آخر میں چاول پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح مراکش میں لشاستہ پیش کیا جاتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ مہمان اگر تکلف میں بھوکا رہ گیا ہو تو اب پیٹ بھر لے۔ کھانے کی چیزوں پر جھپٹ پڑنا بدتمیزی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے جیسے مہمان کھانے پینے کا بڑا ندیدہ ہے۔ یہ لشاستہ کھانا بھی ایک فن ہے۔ انگلیوں سے اس خشک سی خوراک کے نوالے بنا کر منہ میں ڈالنا بہت مشکل ہے۔ علادی کو اس میں بڑی مہارت تھی۔ تین انگلیوں سے گرم گرم لشاستہ اٹھاتا تھا۔ ہتھیلی پر رکھ کر نوالہ بناتا تھا اور پھر اُچھال کر منہ میں ڈال لیتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی شعبدہ باز ایک ہاتھ سے گیند بنا رہا ہو اور دوسرے سے منہ میں ڈال رہا ہو۔

سب سے آخر میں مٹھائی پیش کی گئی جس میں انجیروں اور نارنجیوں کے ٹکڑے موجود تھے۔ اب پاشا نے اپنا نیپکن اٹھایا اور کھانے کی میز پر رکھ دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ ضیافت ختم ہوئی۔

مراکش کے قصبات یا قلعوں کا علاقہ

مراکش کا شہر دیکھنے کے بعد، ہم موٹر کے ذریعہ کوہسارِ اطلس سے گزر کر پہاڑی علاقے میں پہنچا۔ یہاں مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ اس ملک کے صحیح کوائف

کیا ہیں۔ مراکش کے شمالی حصے میں وہ کھیت، باغ اور خیابان ہیں، جن کی دیکھ بھال فرانسیسی آبادکار، بڑے سلیقے سے کرتے تھے، لیکن یہاں یہ صورت نہ تھی۔ اسی طرح یہ علاقہ اقوام بربر کے دیہات سے بھی مختلف تھا جہاں مزروعہ زمینوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پائے جاتے ہیں اور پرانے وقتوں کے سے سامان سے کام لیا جاتا ہے۔ جہاں میں اب پہنچا تھا۔ وہاں سے مراکش کے قصبات یا قلعوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ دراصل یہی قصبات یا قلعے مراکش میں جاگیردارانہ نظام کے نمونے ہیں۔

عموماً یہاں قصبے سے شہر کا وہ حصہ مراد لیتے ہیں جہاں مراکشی آباد ہوں لیکن دراصل اس لفظ کے معنی ہیں قلعہ یا مستحکم مقام۔ یہ قلعہ گارے سے بنایا جاتا ہے اور ازمنۂ وسطیٰ کے قلعوں سے مشابہ ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ مینار گول ہونے کی بجائے مربع ہوتے ہیں۔ جب عربوں نے یہ ملک فتح کیا اس وقت بھی بہت سے قلعے موجود تھے اور اب تک ان میں بہت کم تغیر ہوا ہے۔ رچرڈ شیردل اگر یہ قلعے دیکھ لیتا تو اسے بہت پسند آتے اور مشہور فلم ساز کمپنی میٹرو گولڈن میئر بھی اگر ان قلعوں کو دیکھ لیتی تو بہت خوش ہوتی۔

کسی سڑک پر تو ان قلعوں کی ایک قطار سی نظر آتی ہے، کہیں ایک قلعے اور دوسرے قلعے میں ایک میل کا فاصلہ ہوتا ہے۔ کوئی قلعہ ویران ہے اور کوئی آباد۔ آباد قلعے میں سو کے قریب لوگ رہتے ہیں اور شیخ قبیلہ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہاں پرانے رسم و رواج قائم ہیں، البتہ قبائلی

جنگیں ختم ہو گئی ہیں۔

اطلس سے گزر کر جب میں صحرا کے قریب پہنچا تو مجھے زمین کا رنگ سرخ معلوم ہوا۔ یہاں کے رہنے والے، پہاڑی علاقے کے باشندوں سے بالکل مختلف ہیں۔ حبشیوں کی طرح یہاں بھی بچوں کے چوٹیاں ہوتی ہیں۔

مراکش کے اس علاقے میں بھی نئے اور پرانے زمانے کی قدروں کا اختلاف نمایاں تھا، کبھی میں دیکھتا ہوں کہ اونٹوں کا قافلہ خراماں خراماں چلا جا رہا ہے۔ کبھی ٹرک منگانیز سے لدے نظر آتے ہیں۔ ایک گاؤں میں نے دیکھا جہاں بازار میں سب سے اہم چیز جو بک رہی تھی وہ گدھے کی لید کے اپلے تھے لیکن ساتھ ہی بازار کے ایک طرف موبل آئل کا پمپ بھی تھا اور ایک نیا ٹیکساکو سٹیشن۔

طنجہ شہر ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس صدی کے آغاز میں اس پر بین الاقوامی اقتدار قائم ہوا تو لوگوں کے مزے ہو گئے۔ انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس، تحفہ ٹیکس، وراثت ٹیکس، کچھ بھی تو دینا نہ پڑتا تھا۔ یہاں کا دستور ہے کہ جس شخص کے پاس پاسپورٹ ہو، وہ محض شہر میں سکونت اختیار کرنے سے یہاں کا شہری بن جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر برطانیہ کے مالدار لوگ جو وراثت ٹیکس کے ذریعے اپنی جائداد سے محروم ہوتے جا رہے ہیں، طنجہ پہنچ جائیں تو اپنی جائدادیں بچا سکتے ہیں۔

یہاں بینک کاری کے قانون اتنے نرم ہیں کہ ہر شخص خواہ وہ سرمایہ دار ہو یا نہ ہو، بینک کھول اور چلا سکتا ہے اسی طرح ہر شخص تجارتی ادارہ قائم

کرسکتا ہے اور ان تمام قوانین کی زد سے محفوظ رہ سکتا ہے جن کا مقصد حصّہ داروں کا تحفظ ہے۔

ایکس چینج پر کسی قسم کی پابندیاں نہیں ہیں۔ آپ بازار جائیں اور جس قسم کی کرنسی چاہیں بیچیں یا خریدیں۔ ہر وہ شخص جو بدمعاش، جاسوس یا سمگلر ہونا چاہے، یا ٹیکس سے بچنا چاہے، سونا جمع کرنا چاہے، روپیہ کے کاروبار میں لوگوں کو دھوکا دینا چاہے، اس کے لیے طنجہ میں ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں طنجہ کے باشندے کو بھی طنجرین کہتے ہیں اور ایک پھل کو بھی (نارنگی کی ایک قسم) یہ کہنا مشکل ہے کہ پھل سے شہر کا نام منسوب ہے یا شہر سے پھل کا۔ بہرحال شہر میں ایک لاکھ ستّر ہزار نفوس آباد ہیں۔ کچھ از منۂ وسطیٰ میں ہسپانوی آبادکاروں کے ساتھ آئے تھے اور کچھ بیسویں صدی کے نازیوں کے ستائے ہوئے ہیں

آج کل طنجہ کے غیر ملکی باشندے بہت پریشان ہیں۔ حال ہی میں ایک امریکی اخبار نے ان کے متعلق ایک مضمون شائع کیا جس کی یہ سرخی تھی: "طنجہ میں لوگوں کا اضطراب۔ کاروباری آزادی کے اس چھوٹے سے شہر میں پریشانی کی لہر۔"

بات یہ ہے کہ یہاں کے لوگ سوچ رہے ہیں کیا انہیں پہلی سی مراعات حاصل رہیں گی یا نہیں۔ کہ اب یہ شہر آزاد مراکش کا جزو قرار دیا جا چکا ہے۔ جو آٹھ ملک پہلے اسی شہر کے انتظام کے ضامن تھے انہوں نے حکومت سے دست بردار ہوتے وقت یہ طے نہیں کیا کہ اس کے بعد طنجہ کا سیاسی ڈھانچہ کیا ہوگا۔ یہ ملک بس حکومت سے دست بردار ہو گئے اور اب مراکش پر منحصر ہے کہ وہ غیر ملکی لوگوں کی موجودہ مراعات باقی رکھے یا ختم کر دے۔

مراکش کی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ کم از کم سر دست اس شہر کے مالی اور کاروباری کوائف سے بہت کم تعرض کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس شہر میں باہر کے تاجروں کا جو روپیہ لگا ہے اس سے حکومت کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن کاروباری طبقے کے افراد کو اطمینان نہیں ہوتا۔ وہ سوچتے ہیں کہ محمد پنجم کی رائے بدلتے کیا دیر لگتی ہے! عربوں کے حق میں یا مغرب کے خلاف کوئی تحریک چلے تو سلطان نئے حالات کے مطابق اپنی حکمت عملی میں تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔

امریکہ، کی نظر میں طنجہ کی یہ اہمیت ہے کہ یہاں نشریات کا بہت اچھا انتظام ہو سکتا ہے۔ ایک تو شہر کے محل وقوع اور دوسرے موسم کی وجہ سے موسم ایسا ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو مسلسل چوبیس گھنٹے اور وہ بھی سارے سال) پروگرام نشر کیا جا سکتا ہے اور افریقہ اور یورپ نیز مشرق وسطی کے تمام شہروں کے لئے ریلے کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ کی تجارتی نشریات مثلاً آر، سی، اے اور ریڈیو میکے نے یہاں ٹرانسمٹر نصب کر رکھے ہیں۔ علاوہ ازیں وائس آف امریکہ کا ٹرانسمٹر بھی ہے۔

سر دست مراکش کی حکومت نے کہا ہے کہ جب تک مزید گفت و شنید کے بعد کوئی نیا معاہدہ نہ ہو امریکی کمپنیاں اپنی نشریات جاری رکھ سکتی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ اشارہ بھی کر دیا ہے کہ آر سی اے اور میکے ریڈیو جو پیغام نشر کریں، اس پر ایک سینٹ فی لفظ کے حساب سے حکومت کو ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔ اگر ایسا ہو گیا تو ملک کو پانچ لاکھ ڈالر سالانہ کی آمدنی ہو گی۔

طنجہ کی مسلمان آبادی ہمیشہ سے معاشرے کی سخت پابندیوں میں جکڑی رہی ہے، آزاد مراکش کا جزو قرار دیئے جانے کے بعد سختی کچھ زیادہ ہو گئی ہے اکثر مسلمان عورتیں سخت پردہ کرتی ہیں اور سفید رنگ کا نقاب منہ پہ رکھتی ہیں۔ اگر کوئی بے پردہ عورت نظر آئے تو یوں خیال کیجئے کہ وہ رلیف کے پہاڑی علاقوں کی رہنے والی ہوگی جہاں عورتیں بے پردہ پھرتی ہیں۔ عورتوں کو تھیئٹر میں بھی داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ بازاروں میں جھنڈیوں پر جلی حروف میں لکھا ہوتا ہے کہ مسلمان مرد اور عورت آپس میں باتیں کرتے یا مل کر آتے جاتے دیکھے گئے تو انہیں سخت سزا دی جائیگی (یہ اور بات ہے کہ وہ میاں بیوی ہوں) یہاں تک کہ جرمانے کے علاوہ جیل بھی بھیجا جا سکتا ہے۔ عورتوں کو عموماً یہ سزا ملتی ہے کہ ان کے سر کے اور بھوؤں کے بال مونڈ دیئے جاتے ہیں۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ مذہبی معاملات میں، سخت گیری زیادہ ہوتی چلی جائیگی یا کم۔ بات یہ ہے کہ جس طرح آزاد مراکش کے مستقبل کے متعلق قیاس آرائی مشکل ہے اسی طرح طنجہ کے متعلق بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ یہاں کیا صورت پیدا ہوگی اس شہر کا مستقبل بہت سے عوامل پر منحصر ہے مثلاً یہ کہ دوسرے ملکوں سے کس قسم اور کس حد تک مدد ملتی ہے یا یہ کہ خود یہاں کے لوگ کس تندہی اور سوجھ بوجھ سے اپنے مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں۔ شمالی افریقہ میں جو کھنچاؤ عموماً پایا جاتا ہے وہ کم ہوتا ہے یا نہیں، خاص طور پر عربوں اور آبادکاروں کی دشمنی کی شدت گھٹتی ہے یا نہیں۔

(۶)

امریکہ اور مراکش

امریکہ اور مراکش کے باہمی تعلقات کی نوعیت دونوں ملکوں کے لئے اہم ہے اگرچہ مراکشی یہ کہتے ہیں کہ ماضی میں امریکہ کا جو رویہ رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ نے ان تعلقات کی اہمیت کو شاید محسوس نہیں کیا۔ مثال کے طور پر جب عرب قوم پرست، فرانسیسی استعمار کے خلاف صف آرا تھے تو امریکہ نے عموماً قوم پرستوں سے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن جب معاملہ اقوام متحدہ کے سامنے آیا تو امریکہ نے فرانس کے ساتھ مل کر اس مسئلے پر بحث کو روک دینا چاہا۔

طبعاً مراکشی پوچھنے لگے کہ "اگر امریکہ تمام قوموں کو آزادی کی نعمت کا حقدار سمجھتا ہے تو فرانس کی حمایت کے کیا معنیٰ ہیں۔

بات یہ ہے کہ اس وقت امریکہ سخت مخمصے میں گرفتار تھا۔ امریکہ کو مراکش کے قوم پرستوں سے ہمدردی ضرور تھی کہ خود امریکی بھی آزادی کی خاطر جنگ کرنے پر مجبور ہوئے تھے لیکن فرانس کا ساتھ چھوڑنا بھی مشکل تھا۔ امریکہ چاہتا تھا کہ اگر یورپ میں پھر لڑائی ٹھن جائے تو فرانس کی اعانت اسے حاصل رہے اس لیے ایسا کوئی قدم نہ اٹھا سکتا تھا جس سے فرانس کے موقف کو ضعف پہنچے یا اس کی ساکھ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے سیاستدانوں نے یہ چاہا کہ

دو متضاد نقطہ ہائے نظر میں کوئی سمجھوتے کی صورت پیدا ہو جائے۔

اب صورت حال ایسی پیچیدہ نہیں ہے اور امریکہ اس وعدے کا پابند ہے کہ کہ مراکش کو ٹھوس مالی امداد دی جائیگی۔ جونہی مراکش آزاد ہوا امریکہ کے ماہرین اقتصادیات مراکش پہنچے اور ان امور پر غور شروع ہو گیا کہ مراکش کو مدد دینے کے بہترین طریقے کیا ہو سکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ کوشش بھی شروع ہو گئی کہ مراکش میں بے روزگاری کا کوئی حل تلاش کیا جائے کہ پچھلے چند سالوں سے یہ لعنت اس ملک پر بری طرح مسلط ہو گئی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ امریکہ مراکش سے دوستانہ روابط قائم رکھنا چاہتا ہے بصورتِ دیگر مراکش کی حکومت کسی ایسی طاقت سے مدد طلب کر سکتی ہے جو مغربی جمہوریت کی دشمن ہو مثلاً روس۔ علاوہ ازیں، مراکش میں جو ہوائی اڈے ہیں، وہاں کام ٹھیک طور پر تبھی ہو سکتا ہے کہ مراکش کا تعاون ہر طرح ہمیں حاصل ہو اور حاصل رہے۔ جب یہ اڈے تعمیر کئے گئے تھے اسوقت فرانس کا اقتدار قائم تھا اور اس سلسلے میں امریکہ نے فرانس ہی سے معاہدے کئے سلطان کو تو رسمی طور پر بھی مطلع نہیں کیا گیا کہ اڈے قائم کئے جا رہے ہیں۔ اس وقت مراکش امریکہ کے دفاع کا ایک ضروری جزو تھا اور اس کی کوئی پروا نہ تھی کہ مراکش والے اس بات کو پسند کرتے ہیں یا ناپسند کرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ جب سلطان کا سب سے بڑا لڑکا مولائی حسن ایک دن موٹر پر چڑھ کر ایک اڈے پر گیا تو اتنی سی بات بھی فرانس کے حکام کو سخت ناگوار گذری۔ اب ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ آزاد مراکش کے لوگوں کے جذبات کسی طرح مجروح نہ ہوں۔

اوقیانوس کے ساتھ ساتھ جو مراکش کا ساحل چلا گیا ہے آج کل جٹ طیارہ یا راکٹ، یہاں سے وہاں یا وہاں سے یہاں چٹکیوں میں پہنچ سکتا ہے اگر ہم نے مراکش کو مدد نہ دی اور اس نے مجبوراً روس سے مدد لی تو گویا سمندر کے اس پار دشمن جم کر بیٹھ جائے گا اور کبھی لڑائی ہوئی تو ہمارے ہی تعمیر کردہ اڈّے ہمارے خلاف استعمال کئے جائیں گے۔

گویا ہمارا دفاع اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس نئے ملک کی مدد کریں تاکہ اس کی آزادی قائم رہ سکے اور یہ جمہوری طاقتوں کا ساتھ دے۔ قوم پرستوں کی تحریک ہماری عملی مدد کے بغیر ہی پروان چڑھی لیکن اب جو یہ ملک افلاس، جہالت اور بیماری کے خلاف صف آرا ہے تو اس کی مدد کرنا ہمارا فرض اولین ہے

تیونس میں بے چینی اور بحران

جن چار ملکوں کا ہم نے ذکر کیا ہے ان میں تیونس کی جمہوری ریاست کا رقبہ سب سے کم ہے لیکن اس ریاست کے حالات دلچسپ بھی ہیں اور مزیدار بھی۔

یہ ریاست شرقاً غرباً ۱۲۵ میل اور شمالاً جنوباً ۵۰۰ میل ہے۔ کل رقبہ نیویارک سٹیٹ کے برابر ہوگا جو شمالی افریقہ کے ۱/۴۶ حصے کے لگ بھگ ہے آدھا ملک صحرا ہے۔ آبادی اڑتیس لاکھ ہے اور یہ سب لوگ شہر شکاگو میں سما سکتے ہیں۔ (باشندوں میں دو لاکھ چالیس ہزار یورپین ہیں۔ بیشتر فرانسیسی لیکن اطالوی اور یہودی آبادکار بھی ہیں)

اس ملک کی تاریخ بہت دلچسپ اور حیرت انگیز کوائف سے معمور ہے۔

کہ بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں میں اس ریاست نے شمالی افریقہ کی تاریخ کو خاصا متاثر کیا ہے۔ جو حملہ آور مغرب کی طرف مراکش اور مشرق کی طرف لیبیا نہ پہنچ سکتے تھے وہ عموماً اس ملک کو مسخر کر لیتے تھے۔ پھر یہ کہ فطرت نے شمالی افریقہ کے تمام جغرافیائی خطوں کو نمائندگی دی ہے کہ ریتلا ساحل بھی ہے، درختوں سے لدے پھندے پہاڑ بھی ہیں۔ زرخیز میدان بھی اور خشک بنجر صحرا بھی۔

مختصراً، تیونس، شمالی افریقہ کا مرقع ہے کہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے۔

اس مستطیل ملک کے چاروں گوشوں کی خصوصیات مختلف ہیں۔

شمال مغرب کا علاقہ ہرا بھرا اور زرخیز ہے۔ خشک سالی کی اور بات ہے ورنہ شمالی افریقہ میں اس کا حریف ہی نہیں ہے۔ یہاں ان پہاڑوں پر شاہ بلوط کے بے شمار درخت ہیں جو گویا سمندر سے ابھرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ان کے پیچھے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے سلسلے ہیں جہاں رومن اور فنیقیہ والوں کے آثارِ قدیمہ اسطرح بکھرے پڑے ہیں جس طرح ساحل سمندر پر کنکر۔

یہاں لوہے کی کانیں بھی ہیں اور فاسفیٹ کی بھی، جو کھاد کے کام آتا ہے۔ ڈھلانی حصوں پر بھیڑیں چرتی پھرتی ہیں اور چرواہے سفید کلغی والی گھاس جمع کرتے رہتے ہیں جسے الفا کہتے ہیں اور جو رسیاں، جال، دریاں اور کئی دوسری چیزیں بنانے کے کام آتی ہیں۔

ساتھ ہی شمال مغربی علاقے میں پہاڑ بھی ہیں اور زرخیز میدان بھی۔ یہاں تیونس کی دولت زیتون کے درختوں کی شکل میں بہت کثرت سے پائی جاتی ہے کہ کئی کروڑ ہیں۔ پرانی کہاوت ہے کہ جب کوئی باشندہ زیتون اٹھاتا ہے تو

کہتا ہے "میرے لئے یہ سونا ہے"۔ (اس کے علاوہ گندم، شراب اور کارک بھی ملتا ہے)۔

یہاں رومیوں کے زمانے کے آثارِ قدیمہ بھی ہیں اور اس علاقے کے قدیم ترین شہر کارتھیج کے کھنڈر بھی۔ قریب ہی دارالسلطنت ہے، یعنی تیونس۔ ساتھ ہی مشہور بندرگاہ بزرتہ ہے جو سسلی سے ایک سو میل کے فاصلے پر ہے یہیں فرانس نے بہت بڑا بحری مرکز تعمیر کیا تھا جسے وہ اپنے یورپی گھر کی کنجی کہتا تھا

جنوب کے علاقے ذرا مختلف ہیں۔ بحیرۂ روم کے ہرے بھرے ساحلی علاقے کے اِدھر صحرائی "خطہ" ہے جس کے اردگرد سُرخ رنگ کی پہاڑیاں ہیں۔ یہیں پرانے وقتوں سے بربر غاروں اور کھوہوں میں رہتے آئے ہیں اور ان کے طریق رہن سہن میں ہزاروں سال سے کوئی "تغیر" نہیں ہوا۔ یہ لوگ اصلاً "غار نشین" ہیں۔ شمالی افریقہ میں شاید کہیں لوگ ایسے حالات میں زندگی بسر کرتے ہوں گے۔ یہ لوگ برتن بہت کم بناتے ہیں۔ کپڑا بننا بہت کم جانتے ہیں۔ کھانا پکا کر کھانے سے بھی کم آگاہ ہیں۔

جنوب مغربی حصہ صحرا ہی صحرا ہے۔ یہاں شوراب بھی بہت ہے۔ شوراب کی یہ صورت ہوتی ہے گویا برف کے بلوریں ٹکڑے کسی جگہ جمع کر دیئے گئے ہوں لیکن جو اس شوراب کو عبور کرنا چاہے اسے معلوم ہو گا کہ جان پر بن جاتی ہے۔ چمکدار سطح کے نیچے جو نرم نرم متحرک سی چیز ہے وہ دلدل کی طرح خطرناک ہے۔ شوراب کے کناروں پر نخلستان ہیں جہاں بہت عمدہ کھجوریں پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں دغلت لوز نامی کھجور شمالی افریقہ کی بہترین کھجور تصور کی جاتی ہے

نخلستان کے رہنے والوں سے قطع نظر سب باشندے خانہ بدوش ہوتے ہیں۔ (بدوی) جو اپنے گلوں کے لئے چراگاہوں کی تلاش میں اپنے سیاہ خیمے لیکر کبھی کہیں جاتے ہیں کبھی کہیں۔

تیونس میں زراعت مراکش سے اچھی ہے لیکن معدنیات کم ہیں۔اب پن بجلی سے کام لیکر جو کارخانے قائم کئے گئے ہیں ان کے ذریعے صنعت و حرفت پروان چڑھ رہی ہے۔ ان کارخانوں میں چالیس ہزار باشندے ملازم ہیں۔ باقی تمام لوگ ان دستکاریوں میں لگے ہوئے ہیں جو مراکش سے مخصوص سمجھی جاتی ہیں۔

الجزائر کے مقابلے میں یہاں یورپی آبادکار کم ہیں (باشندوں کی نسبت سے) لیکن مراکش سے زیادہ ہیں۔ شمالی افریقہ کے باقی علاقوں کی طرح کبھی حکومت کے تمام عہدوں پر یہی آبادکار فائز تھے، کارخانوں میں بھی یہی نظر آتے تھے تجارت بھی انہی کے ہاتھ میں تھی اور زمیندار بھی انہی کے پاس تھیں۔

بادی النظر میں تیونس اور دوسرے خطوں کا اختلاف، شمالی افریقہ کا مُرقّع معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ اس خطے کے لوگ زیادہ روشن خیال ہیں اور مراکش یا لیبیا کی نسبت مغربی تہذیب سے قریب تر ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہاں کے باشندوں کی نفسیات بربر قبائل کی نفسیات سے مختلف ہیں صدیوں پہلے بحیرۂ روم کے اس تجارتی مرکز پر بار بار حملے ہوتے رہے۔ ان حملوں سے بربر پیچھے ہٹتے چلے گئے اور دوسرے خطوں میں آباد ہوگئے۔ آج صورت یہ ہے کہ آبادی کا بیشتر حصہ عربوں پر مشتمل ہے اور بربر کے مقابلے میں عرب ہمیشہ سے زیادہ روشن خیال ہوتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو نئے سانچوں میں ڈھال

لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ فرانس نے ۱۸۸۱ء میں اس خطے پر اپنا اقتدار قائم کیا، لیکن اس سے پہلے ہی یہاں عرب زمیندار اور تاجر خوب پھل پھول رہے تھے۔ یہ اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے جسے فرانس والے بورژوا کہتے ہیں اور ہم جسے متوسط طبقہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ شمالی افریقہ کا متوسط الحال طبقہ دراصل انہی لوگوں سے عبارت تھا۔

یہ لوگ فرانس کے مدّاح تھے اور فرانسیسیوں نے رفاہِ عام کے لئے جو کچھ کیا تھا اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، خاص طور پر سڑکوں کی تعمیر اور صحت کی بحالی اور بقا کے لئے جو منصوبے بنائے گئے تھے، ان باتوں کیلئے وہ فرانس کے ممنونِ احسان تھے، اکثر آپس میں فرانسیسی بولتے تھے اور اپنے بچّوں کو فرانسیسی اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں داخل کراتے تھے۔

البتّہ یہ بات انہیں ناپسند تھی کہ فرانس ان پر حکمراں ہے، انہیں امید تھی کہ کبھی نہ کبھی وہ فرانس کی غلامی سے نجات حاصل کر لیں گے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد انہوں نے ایک سیاسی جماعت قائم کی جسے دستور کہتے تھے اور جس کا مقصد یہ تھا کہ فرانسیسی اقتدار کو ختم کر دیا جائے۔

تیونس کا ایک مردِ شجاع

۱۹۳۰ء سے ذرا پہلے دستور کے جلسوں میں ایک عرب قانون داں حبیب بورقیبہ نامی دیکھا جانے لگا۔ یہ دُبلا پتلا، پست قامت نوجوان تھا جسکی آنکھوں سے زندگی کے شعلے نکلتے تھے اور جس کی خطابت ایسی مؤثّر تھی کہ معمولی باتیں بھی سننے والوں کو جوش میں لے آتی تھیں البتّہ وہ خود ٹھنڈے

مزاج کا انسان تھا اور ٹھنڈے دل سے معاملات پر سوچ بچار کرنے کا عادی تھا یہ نوجوان تیونس کی آزادی کے خواب دیکھا کرتا تھا لیکن اس کا نظریہ تھا کہ آزادی جنگ و جدال سے حاصل نہ ہو سکے گی۔ اس کا خیال تھا کہ تیونس پر فرانس کا اقتدار، فرانسیسی توپوں اور فوجی طاقت نے قائم نہیں کیا بلکہ تیونس کے لوگوں کی جہالت نے فرانس کو مسلط کیا یعنی اسکی وجہ تیونس کے لوگوں کی بے علمی ہے جو غریب تھے اَن پڑھ لکھنے پڑھنے سے معذور تھے جو نہایت معمولی اجرت پر کام کرتے تھے اور جو اس خیال سے چپ ہو جاتے تھے کہ تقدیر کا لکھا ہوا ہو کر رہتا ہے۔

حبیب نے سوچا کہ فرانس کے خلاف صف آرا ہونا بے کار ہے اصل کام یہ ہے کہ پامالِ روزگار اَن پڑھ لوگوں کو تعلیم دی جائے اور ان کا سیاسی شعور اتنا بیدار کر دیا جائے کہ وہ نہ صرف آزادی کے طالب ہو جائیں بلکہ ہر طرح اس کے اہل بھی ہوں۔

فرانس نے تیونس میں مراکش کی طرح بہت کم اسکول قائم کئے تھے کہ لوگوں کا غیر تعلیم یافتہ رہنا فرانس کے مفاد کے موافق تھا۔ حبیب نے سوچا کہ وقت کا تقاضا ہے کہ تمام لوگوں کو پڑھا لکھا بنانے کی ملک گیر تحریک چلائی جائے وہ اپنے ہم وطنوں کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ ان کی زبوں حالی اور افلاس کے ذمہ دار خود وہ ہیں، تقدیر نہیں ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے کہ فرانس ان پر حکومت کرتا رہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کوشش سے اپنی زندگی سدھار سکتا ہے اور اپنی تقدیر کو بدل سکتا ہے

دستور کے وہ ارکان، جو فرانس کے آباد کاروں کی طرح، تیونس کی ان پڑھ آبادی کو حقارت سے دیکھتے تھے، حبیب کے ان خیالات کو ایک انتہا پسند سرپھرے انسان کی خرافات سمجھتے تھے لیکن کچھ ارکان اسے سچا اور مخلص بھی سمجھتے تھے۔ قدامت پسندوں نے اسے دبانا چاہا لیکن اس کے دوستوں نے ایک نئی جماعت کی بنیاد رکھ دی۔ جو دستور نو کہلاتی تھی۔ یہ جماعت بھی استقلال کی طرح منظم ہو گئی لیکن فرق یہ تھا کہ اس کے مقابلے میں زیادہ پختہ کار اور مستحکم معلوم ہوتی تھی۔ فرانس سے لڑائی ٹھنی تو حبیب ہی اس جماعت کی رہنمائی کرتا رہا۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر وہ یہ فریضہ یا جیل میں بیٹھ کر سرانجام دیتا یا جلا وطنی کے عالم میں۔

حبیب کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس نے اپنے آپکو پہلے ہی یہ فریضہ ادا کرنے کے لئے تیار کر رکھا تھا۔ وہ ۱۹۰۳ء میں ایک ساحلی شہر یعنی منستر میں پیدا ہوا۔ پانچ سال کا تھا کہ اس کے دو بھائیوں کی نگرانی میں اس کی تعلیم شروع ہوئی۔ اس کا ایک بھائی ایک شفاخانے کا انچارج تھا۔ حبیب نے کچھ مہینے اپنے بھائی کے پاس یہاں گزارے کہ ایک خطرناک بیماری اسے لاحق ہو گئی تھی۔ اسی جگہ اس کے دل میں ان افکار و تصورات کی نشوونما ہوئی جنہوں نے اس کی آئندہ زندگی کا رخ بدل دیا۔

اس کا بھائی محمد احترام آدمیت کا اس حد تک معتقد تھا کہ اس کے خیال میں ہر وہ چیز جو اس احترام کے منافی تھی، چاہے وہ فرانسیسی آقا ہو یا کوئی پرانی اسلامی روایت انسانی حقوق پر کاری ضرب لگاتی تھی۔ بیماری سے صحت

پانے کے بعد جب حبیب دوبارہ اسکول گیا تو یہ خیال لے کر گیا کہ بڑا ہو کر قوم کی خاطر سب کچھ کر گزرے گا۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی تیونس کا باشندہ اس وقت تک انسانیت کے احترام کا مقام حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ آزاد نہ ہو جائے۔

تیونس کے مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ قانون کی تعلیم کے لئے پیرس گیا۔ ۱۹۲۷ء میں وطن لوٹا تو قانون کی ڈگری کے علاوہ ایک فرانسیسی بیوی اور ایک بچہ بھی اس کے ساتھ تھا۔

وہ اپنے دوستوں کو یاد دلایا کرتا تھا کہ "میں فرانسیسیوں کا مخالف نہیں ہوں، تیونس میں صرف ان کی آباد کاری کا مخالف ہوں"۔

یہ درست ہے کہ وہ فرانسیسیوں سے نفرت نہیں کرتا تھا کہ انہوں نے اس کے وطن کی ترقی کے لئے بہت کچھ کیا تھا۔ علاوہ ازیں بعض آباد کار بھی اس کے ہم خیال تھے۔ اس نے اب دستور نو کا باقاعدہ پروگرام بنایا۔ وہ فرانسیسیوں سے نفرت کی تعلیم دینے کے بجائے اپنے مثبت نظریات پیش کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ اس کا پیغام دور افتادہ دیہات تک بھی پہنچ جائے جہاں اکثر لوگ ان پڑھ تھے۔

اس کے پروگرام کا خلاصہ یہ تھا کہ فرانس بتدریج تیونس کی حکومت سے دست کش ہو جائے۔ اس حکومت کے دو پہلو تھے خارجی اور داخلی۔

داخلی امور کی یہ صورت تھی کہ فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کی نگرانی میں سب کام فرانسیسی منصب دار ہی کرتے تھے۔ تیونس کا مسلمان حاکم مراکش کے سلطان کی طرح کٹھ پتلی تھا۔ اس حاکم کی کابینہ کے ہر رکن کا ایک فرانسیسی

مشیر تھا اور تمام فیصلے اسی کی منشا کے مطابق ہوتے تھے۔

خارجی امور براہِ راست پیرس کی مرکزی حکومت کے سپرد تھے۔ فرانس کی فوج تیونس میں مقیم تھی۔ اور تیونس کا دفاع فرانس اور اس کے مقبوضات کے دفاع کی طرح مرکزی حکومت کا فریضہ تھا۔ تیونس براہِ راست کسی دوسرے ملک سے کسی قسم کے روابط قائم نہ کر سکتا تھا۔

حبیب کا پروگرام یہ تھا کہ پہلے تیونس کو ہوم رول دیا جائے یعنی اسے امورِ داخلہ کے تمام مسائل حل کرنے کا ذمہ دار گردانا جائے جب ایسا ہو چکے تو گویا ملک اگلا قدم اٹھانے کے لئے تیار ہو گا۔ یعنی مکمل آزادی کے لئے۔ حبیب کا خیال تھا کہ یہ تمام کام گفت و شنید ہی کے ذریعے طے ہو جائیں گے اور کسی قسم کی بدمزگی پیدا نہ ہو گی۔ وہ اور اس کے ہم خیال دوست یہ چاہتے تھے کہ تیونس اور فرانس تعاون سے کام لیں اور باہمی مفاد کے پیش نظر دوستانہ روابط قائم کریں اور ہمیشہ قائم رکھیں۔

فرانس نے تیونس کے قوم پرستوں سے کسی قسم کی گفت و شنید کرنے سے انکار کر دیا اور حبیب کو ایک خطرناک دشمن تصور کرنا شروع کر دیا چنانچہ ۱۹۳۴ء میں اسے صحرائی علاقہ میں جلاوطن کر دیا گیا۔ دو سال کے بعد اسے وطن واپس آنے کی اجازت ملی تو ۱۹۳۸ء میں جیل میں ڈال دیا گیا۔ اسی سال دستور کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا گیا۔ حبیب کو تیونس کی فوجی جیل میں تھوڑے ہی دن گزرے ہوں گے کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ نازیوں نے فرانس کو شکست فاش دے کر تیونس پر بھی اقتدار قائم کر لیا اور پہلی بات یہ کی کہ حبیب کو رہا کر دیا اور اسے دعوت دی کہ نازیوں کے ساتھ مل کر اتحادیوں کا مقابلہ کرے۔

حبیب نے یہ پیش کش مسترد کر دی اور یوں یہ ثابت کر دیا کہ اس کا یہ دعویٰ صحیح تھا کہ مجھے فرانس سے کوئی عداوت نہیں ہے۔ اس نے تیونس کے ریڈیو پر جو جرمنوں کے تصرف میں تھا تقریر کرتے ہوئے تیونس کے لئے آزادی کی نعمت طلب کی اور بڑی جرأت سے اپنے دوستوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اس دن کے منتظر رہیں جب فرانس اور تیونس کی غلامی سے رہا ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اتحادی فوجیں بزرتہ پر اتریں تو وہاں کے عربوں نے ان سے دوستانہ سلوک کیا اور ہر طرح کے تعاون سے کام لیا۔

لیکن جب نازیوں کو شکست ہوئی اور فرانس پھر تیونس پر قابض ہوا تو سب سے پہلے حبیب ہی کو گرفتار کیا گیا۔ لیکن وہ بچ کر قاہرہ نکل گیا۔ پھر سیر و سیاحت کرتا امریکہ پہنچا۔ یہ ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے وہ وطن لوٹا تو بہت پر امید تھا کہ امریکہ میں اور دنیا کے دوسرے حصوں میں یہ بات ہر ایک کی زبان پر تھی کہ تمام نو آبادیات کو آزادی ملنی چاہیئے۔ حبیب سوچتا تھا کہ شائد اب فرانسیسی گفت و شنید پر آمادہ ہو جائیں اور کم از کم یہ تو مان لیں کہ مستقبل میں کبھی نہ کبھی تیونس کو آزاد کر دیا جائے گا۔

حبیب، حاکم تیونس اور قتل و غارت کا ہنگامہ

حبیب تیونس لوٹا تو وہ قابلِ ذکر شخصیتوں سے ملا۔ ایک تو فرحت حشید تھا جو آزادی کی جنگ میں اس کا رفیقِ کار تھا اور مزدوروں کی تنظیم میں خاص مہارت رکھتا تھا۔ اس کی لیبر یونین شمالی افریقہ کی سب سے طاقتور اور

منظم یونین تھی۔ مزدوروں کے علاوہ اسے تیونس کی اکثر قوم پرست پارٹیوں کی حمایت حاصل تھی، مثلاً دستور پارٹی اور دستور نو پارٹی۔ (جو ابھی تک خلافِ قانون جماعت تھی) حتیٰ کہ یہودی اور حاکم تیونس کے اقارب اور ارکانِ حکومت اس کے حامی تھے۔

فرحت بھی حبیب کی طرح اپنے ہم وطنوں کو متحد کرنا چاہتا تھا اور بہت ٹھنڈے دل و دماغ کا انسان تھا لیکن اس نے عرب مزدوروں کیلئے مناسب اجرت کا جو مطالبہ کیا تھا اس سے تمام فرانسیسی آبادکار اس کے دشمن ہو گئے تھے کہ وہ کم از کم اجرت پر زیادہ سے زیادہ کام عرب مزدوروں سے لینا چاہتے تھے۔ فرانسیسی آبادکاروں کی ایک انتہاپسند خفیہ انجمن "خونیں ہاتھ" کے ارکان خاص طور پر فرحت کے خون کے پیاسے تھے۔

دوسری قابلِ ذکر شخصیت حاکم تیونس کی تھی جس سے حبیب کی ملاقات ہوئی۔ تیونس کا حاکم بوڑھا آدمی تھا کچھ سال پہلے جب اس کا انتخاب ہوا تھا تو اس وقت اس کی عمر کچھ اوپر ۶۰ سال تھی۔ دستور کے مطابق شاہی خاندان کا سب سے بوڑھا فرد، حکمران چنا جاتا ہے۔ یہ دستور فرانسیسیوں کو بہت پسند تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ فرماں روا بوڑھا ہو تو یقیناً قدامت پسند بھی ہوگا اس لئے بہ آسانی فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہے گا۔ اس کا نام سیدی محمد الامین پاشا تھا۔

سیدی محمد الامین پاشا حاکم تیونس اس خاندان کا رکن تھا جو ترکوں کے دورِ اقتدار کے بعد ۱۷۰۵ء سے تیونس پر حکمرانی کرتا چلا آیا تھا۔ اس کے آبا و اجداد

بحری قزاقوں کے زمانے میں بھی صاحب تخت وتاج تھے۔ اس خاندان کے لوگوں کی عادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ابھی تک اُسی ظلمت کے عہد میں زندگی گزار رہے ہیں۔

جب سیدی امین پاشا مسند نشین ہوا تو جاگیردارانہ نظام کے مشرقی حکمرانوں کی طرح اس نے اپنی ایک فوج بھی ملازم رکھی۔ اسے اپنی کیمیاوی تجربہ گاہ میں عجیب وغریب نسخے تیار کرنے کا شوق تھا۔ گویا ازمنہ وسطیٰ کا وہ کوئی کیمیا ساز ہو۔ اسے کوئی مغربی زبان تو کیا آتی عربی میں بھی معمولی شُدبُد ہی رکھتا تھا۔

وہ بے جا اسراف کا عادی نہ تھا۔ فرانسیسی کہتے تھے کہ اسے اسراف کا طریقہ سرے سے معلوم ہی نہ تھا۔ البتہ اسے تنخواہ بہت ملتی تھی۔ اس کے خاندان کے دوسرے ارکان بھی پبلک کے خزانے سے تنخواہ پاتے تھے کہ ان کے لئے کوئی کام کرنا باعثِ ننگ تھا۔

جب میں قصرِ شاہی پہنچا کہ سیدی کی زیارت سے مشرف ہوں تو مجھے یہ دیکھ کر بڑا لطف آیا کہ حاکم تیونس، ایک محراب نما چھجے کے پاس کھڑکی میں بیٹھا ہے جہاں سے بازار کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ وہ گویا اپنے زعم میں بازار میں چلنے پھرنے والوں کو خفیہ طور پر دیکھ رہا تھا اور بچوں کی طرح جاسوسی کا کھیل کھیل رہا تھا

حبیب نے اس حاکم سے اعانت طلب کی تھی۔ بہ ظاہر یہ اقدام بے سود معلوم ہوتا تھا۔ کہ اکثر توم پرست شاہی خاندان کے ارکان کو بے فیض ہونے میں جونکوں سے تشبیہ دیتے تھے۔ خود حاکم کو مذہبی پیشوا کی حیثیت بھی حاصل نہ تھی (جیسی فرماں روائے مراکش کو حاصل ہے کہ حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں

سے تھا اور ایک مذہبی فرقے کا پیشوا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ حاکم تیونس نے اپنے محرم راز دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ میں اپنے ملک کی آزادی کا خواہاں ہوں اس کا ایک لڑکا قوم پرستوں کی تحریک کے پرجوش کارکنوں میں شامل تھا اس کی لڑکی کی شادی ایک قوم پرست عرب سے ہوئی تھی (جسے قید کر دیا گیا تھا) اور یہ لڑکی خفیہ طور قوم پرستوں کی مدد کرتی تھی۔ بہر حال ملک کا فرماں روا برائے نام ہی سہی، سیدی محمد ہی تھا اور اس وقت جو اعانت حبیب چاہتا تھا وہ سیدی محمد ہی کر سکتا تھا۔ حبیب نے حاکم تیونس سے درخواست کی کہ وہ تیونس کے قوم پرستوں کی طرف سے اقوام متحدہ سے مدد مانگے تاکہ تیونس کی حق آزادی کے حصول میں آسانی ہو۔ تیونس کے حاکم نے یہ درخواست منظور کر لی۔ فرانس والوں کو جب اس کا پتہ چلا تو انہیں سخت ناگوار گزرا۔

فرانسیسیوں نے پہلے تو حاکم کو مجبور کیا کہ وہ اپنے ارادے سے باز رہے۔ پھر حبیب کے درپے آزار ہوئے۔ پہلے اسے تیونس کے ساحل کے قریب ایک جزیرے میں اسیر رکھا۔ پھر یہ سوچ کر کہ شاید یہاں سے وہ اپنے رفیقوں کے ساتھ خط و کتابت کر سکے اسے فرانس کے شمالی ساحل کے پاس ایک جزیرے میں جلاوطن کر دیا کہ سینکڑوں میل دور تھا۔

چند ماہ بعد، فرحت کو کچھ لوگوں نے دن دہاڑے گھیر لیا اور گولیوں کی باڑھ مار کر ڈھیر کر دیا۔ قاتل گرفتار تو نہ کئے جا سکے لیکن یہ سب کو یقین تھا کہ وہ خونیں ہاتھ ناپی فرانسیسی آبادکاروں کی خفیہ انجمن کے ارکان ہیں۔

حبیب کی جلاوطنی کے بعد فرحت کی موت فرانس اور تیونس دونوں کے لئے ایک حزنیہ ثابت ہوئی کہ نتیجۃً تیونس کے علاوہ مراکش میں بھی خونریزی ہوئی اور بلوے ہوئے۔ سینکڑوں آدمی مارے گئے اور دنیا کے اکثر ملکوں نے فرانس کو قصوروار ٹھہرایا۔ تیونس میں وہ عرب جو فرحت اور حبیب کے کہنے کے مطابق اب تک آزادی کی جنگ یوں لڑ رہے تھے کہ خوں ریزی نہ ہو اور اس سلسلے میں بڑے صبر سے کام لے رہے تھے، وہ سب بھڑک اٹھے۔

اب دہشت پسندوں کے ایک منظم گروہ نے فرانسیسی آبادکاروں کے زراعتی فارموں پر حملہ کر دیا اور ملک میں لوٹ مار اور خون ریزی کا بازار گرم کر دیا۔ ان میں کچھ تو صرف لوٹ مار اور غارت گری کے لئے قوم پرستوں کے ساتھ مل گئے تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کا مقصد اپنے وطن کا تحفظ تھا۔ بہرحال آبادکاروں کو جی بھر کر لوٹا گیا۔ فرانسیسی آبادکاروں کو یقین ہو گیا کہ تمام عرب مل کر انہیں تہس نہس کر دینا چاہتے ہیں۔ اس صورت حال میں انہوں نے فرانس سے فوج کی مدد مانگی چنانچہ فرانس نے تیونس میں مزید فوج بھیج دی۔ فوجی کمک پہنچ جانے کے باوجود دہشت پسندوں کی گرمیاں نہ صرف جاری رہیں بلکہ اور تیز ہو گئیں۔ ایک چکر سا چلنے لگا۔ تیونسی مارے گئے۔ غرض قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ اور روزانہ کوئی نہ کوئی سیاسی راہنما مارا جاتا۔

تیونس کا موقف

اس اثنا میں کوئی ایک درجن ایشیائی اور عرب ممالک کی تائید حاصل کر کے تیونس نے اقوام متحدہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ فرانس سے کہا جائے کہ تین سال کے اندر اندر تیونس کو

آزادی دے دے۔ فرانس اس مطالبے سے جھنجھلا گیا۔

فرانس کا موقف تھا کہ تین سال کے اندر تیونس کے لوگ، اپنے ملک پر حکومت کرنے کے قابل نہیں ہو سکیں گے۔ اس کے علاوہ فرانس کا کہنا تھا کہ وہ ملک میں اصلاحات نافذ کرنے کا منصوبہ بنا چکا ہے جسے عام طور پر باشندے پسند کریں گے۔ فرانس کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ وہ تیونس پر حکومت کرنے کا حق رکھتا ہے کہ اس ملک کی بہتری کے لئے بہت کچھ کر چکا ہے۔

فرانسیسی منصب داروں نے اپنے دعوے کے اثبات میں مندرجہ ذیل اعداد و شمار پیش کئے۔

(۱) ۱۸۸۱ء میں جب فرانس نے تیونس پہ اقتدار قائم کیا تھا، اس وقت ملک میں سڑکیں سرے سے گویا موجود ہی نہ تھیں۔ ریل کی پٹڑی صرف ۱۱۷ میل لمبی بچھی ہوئی تھی۔ اس کے مقابلے میں اب ۹۹۰۰ میل لمبی سڑکیں، اور ۱۳۵۰ میل لمبی ریل کی پٹڑیاں بن چکی ہیں۔

(۲) دو بڑے بند باندھے جا چکے ہیں۔ مزید بند زیرِ تعمیر ہیں۔ اب تک پینتالیس ہزار ایکڑ زمین زیرِ کاشت لائی جا چکی ہے۔

(۳) ۱۸۸۱ء میں صرف دس لاکھ ایکڑ زمین میں گندم کی کاشت ہوتی تھی۔ اب تئیس لاکھ ایکڑ میں گندم بوئی جاتی ہے (اس میں سے ۶۱۱۰۰۰ ایکڑ یورپینوں کی ملکیت ہے)۔

(۴) تیونس کے سالانہ مصارف کا اٹھاون فیصدی فرانس کے خزانے سے دیا جاتا ہے۔

تیونس کا موقف بھی بہت معقول تھا۔میں وہیں تھا۔میں نے دیکھا کہ تیونس میں تقریر و تحریر کی آزادی مفقود تھی جلسہ کرنے پر پابندی عائد تھی۔شہری آزادی ناپید تھی۔ڈاک پر سخت سنسر قائم تھا۔حکومت ایک ایک خط کھول کر دیکھتی تھی صحرا کے بندی خانوں میں چھ ہزار سیاسی قیدی سڑ رہے تھے جن پر نہ کوئی الزام عاید کیا گیا تھا اور نہ کسی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

ایک نوجوان خاتون وال جو صحرا کے خوفناک بندی خانے سے رہا ہو کر آیا تھا میں نے اس سے حالات پوچھے۔اس کا کہنا تھا کہ نہ تو اسے گرفتاری کے وقت بتایا گیا کہ اس کا قصور کیا ہے نہ رہائی کے وقت کچھ بتایا گیا کہ کیوں چھوڑا جا رہا ہے۔وہ کہتا تھا کہ ہمارے سروں پر تو گویا ہر وقت تلوار لٹکتی رہتی ہے۔نہ معلوم کس وقت گر کر ہمیں ہلاک کر دے۔

۱۹۵۴ء کے موسم بہار کے وسط میں تیونس میں خانہ جنگی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔حصولِ آزادی کی جدوجہد میں تیونس کے قوم پرستوں کو امریکہ اور اقوام متحدہ سے کوئی اعانت نہ ملی۔ہاں ان عرب ملکوں نے تیونس کی پوری مدد کی جو عرب لیگ کے رکن تھے۔عرب لیگ کے ممبروں نے متحد ہو کر فرانس سے سخت احتجاج کیا اور تیونس کے معاملے میں مغربی ملکوں کی خاموشی دیکھ کر عرب لیگ نے دنیا کے سارے مسلمانوں کو مغربی طاقتوں کے خلاف اکسایا۔قاہرہ میں مذہبی راہنما ساری دنیا کے مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے تھے کہ فرانس کا اقتصادی، تجارتی، سیاسی اور ثقافتی مقاطعہ کیا جائے۔اس سیاسی ماحول میں فرانس میں حکومت بدل گئی اور مینڈیس فرانس، فرانس کا وزیر اعظم مقرر

کیا گیا مینڈیس فرانس کے برسرِ اقتدار آتے ہی تیونس اور مراکش، دونوں ملکوں میں واقعات نے ایک نیا رُخ اختیار کر لیا۔ وہ ہوائی جہاز سے تیونس پہنچا۔ دستورِ نو پر جو پابندیاں عائد تھیں وہ اٹھالیں۔ جبیب کو اجازت دی گئی کہ فرانس کے سرکاری عہدہ داروں سے گفت و شنید کرے اور تیونس کو فوراً ہوم رول دینے کا وعدہ کیا۔

اِس کے بعد اگر فرانس اپنا وعدہ پورا کر دیتا اور تیونس کو ہوم رُول دے دیتا تو میرے خیال میں تیونس کے قوم پرستوں کو یہ طاقت حاصل نہ ہوتی کہ وہ مکمل آزادی کا مطالبہ کرتے اور اسے حاصل کر لیتے بلکہ اس کے برعکس فرانس اس وقت تک تیونس کی حکومت میں دخیل ہوتا۔ لیکن ہوا یہ کہ فرانس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا:

فرانسیسی آبادکاروں کی اکثریت اس بات سے خائف تھی کہ اگر وہی جن کو حقارت سے دیکھتے تھے ان پر حکمرانی کرنے لگے تو ان کا حشر کیا ہوگا۔ فرانس کے بنک کار یہ سوچنے لگے کہ قحط سالی کی وجہ سے اقتصادی نظام پہلے ہی درہم برہم ہو چکا ہے اب اگر سیاسی انقلابات واقع ہوئے تو معاملات بالکل ہی چوپٹ ہو جائیں گے اور ان کا سارا روپیہ ڈوب جائے گا۔ ان تمام باتوں پر غور و فکر کرنے کے بعد فرانسیسی آبادکار اس صورتِ حالات سے بچنے کی پوری کوشش کرنے لگے۔

یہ دونوں گروہ، آبادکار اور بنک کار متحد ہو گئے اور دل میں یہ بات ٹھان لی کہ مینڈیس فرانس کا وعدہ پورا نہ ہونے دیں گے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر مینڈیس فرانس کی اصلاحات نافذ ہوئیں تو اِن کا کاروبار چوپٹ ہو جائیگا چنانچہ انہوں نے ایسے حالات پیدا کئے کہ چھ ماہ کے بعد ہی بے چارے مینڈیس فرانس کو

حکومت سے مستعفی ہونا پڑا۔ اس کے بعد اب فرانس اِن تمام وعدوں سے منحرف ہو گیا جو سابق وزیراعظم مینڈیس فرانس نے شمالی افریقہ اور تیونس کے متعلق کئے تھے۔

اب تیونسی جھنجھلا اُٹھے اور ایک خفیہ انجمن کے رکن بن گئے "جو انجمن حریت تیونس" کہلاتی تھی۔ اِن لوگوں نے مغرب سے مدد مانگنے کی بجائے عرب لیگ سے رشتہ جوڑا جس کی قیادت مصر کے سپرد تھی۔ بعد میں روس نے ان لوگوں کو ہر طرح کی شہ دی۔ اِن لوگوں کا خیال تھا کہ قاہرہ سے ہتھیار مل جائیں گے اس لئے اب باقاعدہ فرانس کے خلاف لڑائی شروع کر دینی چاہیئے۔

فرانس کو محسوس ہو گیا کہ تیونس میں ایک بحرانی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اُس وقت نہ صرف تیونس اور مراکش کے عرب، بلکہ الجزائر کے عرب بھی فرانس کے خلاف ایک منظم بغاوت پر آمادہ تھے اور اِن سب جگہوں پر خون ریزی اور فسادات کا سخت خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

اُس وقت فرانس نے سوچا کہ اگر یہ بغاوت کامیاب ہو گئی تو فرانس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔ اس کا انجام نہ صرف یہ ہوگا کہ شمالی افریقہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ اس ملک کو روس فرانس کے خلاف یورش کے لئے استعمال کرے اور بحر روم کا اہم بحری اڈا روس کی کاروائیوں کا صدر مقام بن جائے۔ اس صورت حال میں فرانس کو احساس ہوا کہ شمالی افریقہ میں حبیب ان کا بہترین حلیف ثابت ہو سکتا ہے۔ فرانس، اس حقیقت سے باخبر تھا کہ حبیب عربوں کو مغربی طاقتوں کے خلاف صف آرا دیکھنا نہیں چاہتا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ حبیب اشتراکیت کا بھی مخالف ہے۔ حبیب کا ہمیشہ

سے یہ نظریہ تھا کہ عرب ملکوں کو صرف مغربی ملکوں کی فنی، سائنسی اور مالی اعانت کی ضرورت ہے۔

فرانسیسی سیاست دانوں نے محسوس کیا کہ اس وقت اگر وہ حبیب سے تعلقات ٹھیک کر لیں گے تو ان خطرات سے محفوظ رہ سکتے ہیں جو شمالی افریقہ میں فرانس کی حکومت کے سر پر منڈلا رہے ہیں۔ انھی دنوں ایک فرانسیسی افسر نے کہا: "برسوں ہم، حبیب کو حقیر سمجھتے رہے، اسے نظر انداز کرتے رہے بلکہ اسے کچلنے کی کوشش کرتے رہے لیکن اب ہمیں معلوم ہوا کہ ہم غلطی پر تھے۔ اور حبیب بہت بڑا آدمی ہے۔

لطف یہ کہ ان حالات میں بھی فرانس تیونس کو ہوم رول دینے کے وعدے سے آگے نہ بڑھا چنانچہ جب فرانس کے سرکاری افسروں کے ساتھ حبیب کی گفت و شنید ہوئی تو وہی ہوم رول دینے کی تجویز پیش کی گئی (جو مینڈس فرانس کے زمانے کی بات تھی) اس کا مطلب یہ تھا کہ تیونس کے خارجی معاملات کو نمٹانا فرانس کا منصب ہوگا۔ اور تیونس کو یہ موقع نہ ملے گا کہ دوسرے عرب ممالک سے مل کر کوئی متحدہ محاذ بنا سکے۔ اس گفتگو میں ملک کا فوجی دفاع بھی فرانس کی ذمہ داری قرار دیا گیا، اس مقصد کے لئے تیونس میں فوج بھی رکھی جا سکے گی اور بزرتہ کے بحری اڈے پر بھی فرانس کا اقتدار ہوگا۔

حبیب اور اس کے رفقا نے، بہ غایت فراست یہ تجویز منظور کر لی۔ کچھ عرصہ بعد، حاکم تیونس کے محل میں ایک شاندار تقریب منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں حاکم تیونس کی منظوری کے لئے وہ دستاویز پیش کی گئی جس کی رو سے

حاکم تیونس کو اپنے ملک کے اندرونی معاملات میں مکمل اختیارات دیئے گئے تھے۔ اس موقع پر محل سے باہر بے شمار لوگ جمع تھے، اور جب جبیب محل سے باہر نکلا تو جبیب زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔

اب بہ ظاہر سب معاملات سدھر گئے تھے اور فرانس نے "بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی" پر عمل کر کے اپنی معاملہ فہمی اور تدبّر کا ثبوت دیا تھا۔

تاہم ابھی بات ختم نہ ہوئی تھی۔ جبیب نے ہوم رُول اس لئے منظور کر لیا تھا کہ مکمل آزادی کی گفت و شنید کے لئے راہ ہموار ہو جائے۔ اس کا عزم راسخ تھا کہ وہ آزادیٔ کامل کی منزل پر پہنچ کر دم لے گا۔ لیکن کچھ جذباتی لوگوں نے ہوم رول منظور کر لینے کی وجہ سے اس کے خلاف سخت پروپیگنڈا کیا اور یہاں تک کہنا شروع کیا کہ وہ غدّار ہے اور اس نے اپنا ملک فرانس کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اب دہشت پسندوں نے آبادکاروں کے ساتھ جبیب کے ساتھیوں کو بھی تنگ کرنا شروع کر دیا اور لوٹ مار کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ جبیب اس ماحول میں بڑے ضبط و تحمل سے افرانس کے ساتھ گفت و شنید میں مصروف رہا۔ اس کا اب بھی یہی خیال تھا کہ مکمل آزادی لڑے بھڑے بغیر حاصل ہو سکتی ہے بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ جبیب کا خیال ٹھیک تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب ایک طرف مراکش مکمّل آزادی کا مطالبہ کر رہا تھا، دوسری طرف عرب لیگ کے ارکان ان دونوں ملکوں کی آزادی کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

اس کا ردِّ عمل یہ ہُوا کہ دنیا کے دوسرے ممالک کو تیونس اور مراکش کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ امریکہ جو پہلے فرانس کی مخالفت پر رضامند نہ ہوتا تھا، اب قوم پرستوں

کی تائید پر آمادہ ہوگیا۔ امریکہ کی اس تبدیلی سے فرانسیسی آبادکار مشتعل ہو گئے اور ان برافروختہ آبادکاروں نے تیونس میں امریکی سفارت خانے کو برباد کر دیا تیونس کے لئے حالات برابر سازگار ہو رہے تھے۔ فرانس کو روز بروز یقین ہوتا جا رہا تھا کہ تیونس کے لوگ محض ہوم رول پر رضامند نہ ہوں گے۔ فرانس کو اب یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ اب تیونس اکیلا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں بھی ہیں۔ آخرکار مکمل آزادی کا ایک فارمولا فریقین میں طے پا گیا ۲۰ مارچ ۱۹۵۶ء کو مراکش کی آزادی کے دو ہفتہ بعد تیونس پر فرانسیسی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ اور تیونس نے مکمل آزادی حاصل کر لی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد تیونس میں آزادانہ انتخابات ہوئے اور ایک قومی اسمبلی کا قیام عمل میں آیا۔ جس میں عوام کے چنے ہوئے نمائندے تھے۔ جولائی ۱۹۵۷ء میں اس اسمبلی نے تیونس کے بوڑھے حاکم کو معزول کر کے بادشاہت کے خاتمہ کا اعلان کیا اور تیونس کو ایک جمہوریت قرار دیا۔ نئی ریاست کا پہلا صدر بہ اتفاق آراء حبیب بورقیبہ منتخب ہوا۔

آزادی کے بعد تیونس اور اسکے مسائل

تیونس پچھتر برس کے بعد فرانس کی غلامی سے آزاد ہوا۔ آزادی کے بعد تیونس کو بھی وہ سارے مسائل درپیش تھے۔ جو ایک نئے ملک کو عموماً پیش آتے ہیں۔ لیکن تیونس کو چند مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ مسائل یہ تھے



(۱) افلاس۔ (۲) رعایا کے مختلف طبقوں کے مابین کشیدگی۔

(۳) فرانس کے ساتھ پیچیدہ روابط کا حل۔

جب تیونس کو آزادی ملی اس وقت افلاس کا مسئلہ بہت اہم تھا۔ یہ ملک یوں بھی کبھی خوشحال نہیں رہا۔ عموماً آبادی کا تہائی حصّہ کافی خوراک سے محروم رہتا ہے۔ فرانس نے صحتِ عامہ کے جو اقدامات کئے تھے ان کی وجہ سے قومی صحت میں ترقی ہو گئی تھی آبادی روز افزوں تھی۔ شرح اموات گھٹ گئی تھی۔ اور بیماریاں کم ہو گئی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہر سال تیونس میں بھوکے رہنے والوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ تیونس کے اربابِ حلّ وعقد کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ یا تو ملک میں خوراک زیادہ پیدا کی جائے یا ملک کی آمدنی کس طرح اتنی بڑھائی جائے کہ غلّہ درآمد کیا جا سکے اور دوسری ضروریات کی چیزیں منگوائی جا سکیں۔

تیونس کے اربابِ اختیار یہ جانتے تھے کہ خوراک زیادہ پیدا کرنے کیلئے (بشرطیکہ قحط سالی پھر مسلط نہ ہو جائے) بہتر کاشت کاری کے طریقے اختیار کرنا ہوں گے اور زیادہ اچھے ساز و سامان سے کام لینا پڑے گا۔ آمدنی زیادہ بھی ہو گی کہ لوگوں کو روزگار مہیا کیا جائے اور اس کے لئے ضروری ہو گا۔ کہ نئے کارخانے کھولے جائیں اور نیا کاروبار شروع کیا جائے لیکن ان چیزوں کے لئے تیونس کے پاس روپیہ نہ تھا۔ اور ملک میں بے روزگاری بڑھ رہی تھی۔

باقی رہی طبقاتی کشیدگی تو ملک میں ایسے عرب تھے جو ابھی تک فرانس

والوں سے برگشتہ تھے اور ایسے بھی تھے جو عرب لیگ کے زیرِ اثر یہودیوں کے خلاف تھے۔ یہودی بھی عربوں کی مخالفت پر اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ بہت سے فرانسیسی آبادکار اپنی زمینداریاں بیچ کر ملک کو خیرباد کہنا چاہتے تھے۔ نیا کاروبار کرنے پر کوئی راضی نہ ہوتا تھا۔ یہودی بھی ملک چھوڑکر اور کاروبار کو سمیٹ کر جانا چاہتے تھے۔ اس صورتِ حالات میں ملک کی اقتصادی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔

حکومت نے ان اُلجھنوں کو سلجھانے کی بہت کوشش کی۔ ملک کا مفاد اسی میں تھا کہ تمام طبقات کے حقوق محفوظ رہیں اور کسی کا روپیہ نہ ڈوبے تاکہ ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ یہودی، فرانسیسی اور عرب، باہم مل کر رہ سکیں۔

فرانسیسی اقتدار ختم ہونے کے چند ماہ بعد حبیب نے ایک امریکی نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے حسبِ معمول بے تکلفانہ کہا "بعض فرانسیسی تو یہ خیال کرتے تھے کہ ہم اپنی حکومت قائم ہوتے ہی ان کو سمندر میں غرق کر دیں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تیونس سے زیادہ پُرامن شہر آج دنیا میں شاید ہی کوئی ہو۔"

یہ صحیح بات ہے کہ وہ دیہات جو بڑے بڑے شہروں سے دور تھے اخاص طور پر الجزائر کے سرحدی علاقے، اتنے پرامن نہ تھے۔ اب رہا یہ سوال کہ فرانس سے تیونس کے غیر یقینی سے روابط کی صورت کس طرح بدلی جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک الجزائر کے حالات نہیں سدھریں گے، کم و بیش یہی

صورت قائم رہے گی۔

تیونس کے مسائل حال ہی میں حبیب نے کہا ہے "تیونس چھوٹا سا ملک ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک کو انسانیت کے احترام کا ایک مثالی نمونہ بنا دیں اور یہاں سماجی انصاف ایسے قائم کر دیں کہ سب عرب ممالک اس ملک کو معیاری ریاست تصور کریں"۔

امورِ داخلہ کے سلسلے میں ملک نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ پرانے وقتوں کے جو دستور اور رسم و رواج چلے آتے تھے اور جن سے احترام آدمیت کے تصور کو ضعف پہنچتا تھا (خاص طور پر عورتوں کے معاملے میں) ان کے خلاف منظم تحریک چلائی۔

اب عورتوں کو ووٹ دینے کا حق دے دیا گیا۔ کثرتِ ازدواج خلافِ قانون قرار دی گئی ہے۔ بات بات پر طلاق دینا ممنوع ہے۔ پندرہ سال سے کم کی لڑکیوں کی شادی نہیں ہو سکتی۔ پہلے قاضی خاندانی اور ذاتی الجھنوں اور قضیوں کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔ اب یہ اختیارات باقاعدہ دیوانی عدالتوں کے سپرد کئے گئے۔ مقدمات پرانی روایات اور رواج کے مطابق نہیں نمٹائے جاتے بلکہ جدید قانون کے مطابق ان کا فیصلہ ہوتا ہے۔

حبیب نے قدامت پسندوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہم نے بہت سی اصلاحات نافذ کی ہیں۔ اس لئے طبعاً پرانے بڈھوں نے ان کی مخالفت کی ہے۔ لیکن آبادی کی اکثریت ہمارے ساتھ ہے"۔

تیونس کے عہدہ داروں نے نئے بند اور مدرسے تعمیر کرنے کے

منصوبے بھی تیار کئے ہیں اور کاشت کاری کے متعلق بھی نیا ساز و سامان مہیا کرنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ ملک کی معدنی دولت سے فائدہ اٹھانے کے نئے طریقوں اور تعلیم یافتہ باشندوں کو عہدوں پہ فائز کرنے کے وسیلوں پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ تمام باتوں کے لئے روپے کی ضرورت ہے اور اصل مسئلہ وہی افلاس ہے جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

امریکہ نے تیونس سے اپنی ہمدردی کا اظہار تو کیا ہے۔ لیکن خالی خولی زبانی جمع خرچ سے تو بات نہیں بن سکتی۔ اگر امریکہ نے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا تو افلاس بڑھ کر رہے گا۔ زندگی کا معیار پہلے ہی پست ہے اگر یہی صورت رہی تو اور بھی پست ہو جائے گا۔ پھر معلوم نہیں بات کہاں جا کر ٹھہرے۔ ممکن ہے تیونس کے باشندے مایوس ہو کر حبیب جیسے اعتدال پسند سے منہ موڑ لیں اور ان انتہا پسندوں کا ساتھ دینے لگیں جو یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ہم فرانسیسی آباد کاروں سے زمین چھین کر مقامی باشندوں میں تقسیم کر دیں گے۔ یہ ہوا تو بلا گلے پڑ جائے گی اور ملک کی اقتصادی حالت اور بگڑ جائے گی۔

بہ الفاظ دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ تیونس کی تقدیر جزواً امریکہ کی فراست اور عملی ہمدردی پہ منحصر ہے۔

دو پرانے دار السلطنت۔ تیونس اور کارتھیج

تیونس دنیا کے قدیم ترین دار الحکومتوں میں سے ایک ہے۔ چوتھی صدی

میں سسلی کے ایک باشندے نے فوجی اڈا تعمیر کیا تھا کہ قریب کے شہر کار تھیج کو غارت کیا جا سکے۔ لیکن اس قدامت کے باوصف اس شہر کی انفرادیت سیاح پر ظاہر نہیں ہوتی۔ چار لاکھ کی آبادی میں فرانسیسی اور اطالوی کثرت سے ہیں۔ ہاں اس حصے میں جہاں عربوں کی گنجان آبادی ہے وہاں خالص عربی مناظر نظر آتے ہیں جن کی رنگینی داستانوں میں مذکور ہے۔

یہ شہر گاڈوم سی رخلیج کے تنگ سرے پر واقع ہے اور لڑائی کے دنوں میں اس کی محفوظ بندرگاہ بڑی اہم شمار کی جاتی ہے دوسری جنگِ عظیم میں اتحادیوں اور محوری طاقتوں کے درمیان یہاں کانٹے کی تول لڑائی ہوئی۔ بمباری نے بندرگاہ کا اکثر حصہ تباہ کر دیا تھا۔ بلکہ قریب کی عمارتیں بھی تباہ کر دی تھیں۔ شمالی افریقہ میں اتحادیوں کو فتح ہوئی تو مرمت کا کام شروع ہوا۔

فتح کے موقع پر تیونس کے بازاروں میں فوجوں کی سلامی لی گئی اور اس موقع پر اتحادی فوجوں کے کمانڈر جنرل آئزن ہاور بہ نفس نفیس فوجوں کو گزرتے دیکھ رہے تھے۔ تیونس کے باشندے بڑے جوش و خروش سے فوجوں پر پھول نچھاور کر رہے تھے۔ آج بندرگاہ کی یہ صورت ہے کہ بمباری کا سراغ بھی نہیں ملتا۔

شہر کے ریلوے اسٹیشن کے بالمقابل ایک جگمگ جگمگ کرتی ہوئی عمارت ہے جس پر لکھا ہے "سائنس اور زراعت کی خدمت میں ہدیہ نیاز" انہی دو چیزوں پر تیونس کے مستقبل کا مدار ہے یہیں پیسچر انسٹی ٹیوٹ کی عمارت

بھی موجود ہے، جو نسبتہً زیادہ شاندار ہے یہیں فرانس کا مشہور سائنسداں اور نوبل انعام یافتہ چارلس نکول ۱۹۳۵ء تک یعنی مرتے دم تک مختلف خطرناک بیماریوں کے متعلق تحقیقات کرتا رہا۔ جو افریقہ سے مخصوص ہیں ایسی تحقیقات کے دِنوں میں بعض اوقات نکول جان پر کھیل کھیل گیا۔ مگر کیڑوں کے متعلق اس کی تحقیقات بہت ہی مفید ہے کہ افریقہ کے بے شمار باشندے اسی بیماری کی وجہ سے اندھے ہو جاتے ہیں۔ نکول نے افریقہ کے باشندوں کی خاطر اپنی جان دے دی۔ اس عمارت میں ہر چیز اس شہید علم کی یاد دلاتی ہے جس کی تحقیقات نے ہزاروں انسانوں کو پھر بینائی بخشی۔

بندرگاہ کے قریب جو کشادہ بازار ہیں ان کے پیچھے وہ حصہ ہے جہاں عرب رہتے ہیں۔ پہاڑ کی ڈھلانوں پر اُن کے مکانوں کی۔ نیلگوں اور سپید مہتابیاں بڑی خوش نما معلوم ہوتی ہیں۔ بازار یا سوق مختلف حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ہر حصہ کسی خاص جنس کی چیزوں سے مخصوص ہے، کہیں تانبے کے برتن، کہیں عطریات کہیں جواہر اور کہیں شہد کی مٹھائیاں بکتی ہیں۔

عربوں کا سوق یا بازار دراصل ایک بہت بڑا ڈیپارٹمنٹ سٹور ہوتا ہے کہ کھلے میدان میں پایا جاتا ہے۔ یہاں چیزیں بنائی بھی جاتی ہیں اور بیچی بھی جاتی ہیں۔

ایک بازار میں مسلمان ماہ رمضان میں روزہ افطار کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ یہاں مغربی تھیٹر عربی صورت بھی موجود ہے جہاں

خوب ہنگامہ برپا ہوتا ہے۔ عرب یہ تماشا خوب مزے سے دیکھتے ہیں۔

بہار میں شہر یاسمین کی خوشبو سے مہکتا ہے جیسے بہرت مبارک پھول گنتے ہیں۔ جسے دیکھو، بچہ ہو یا بوڑھا، دوکاندار ہو یا پیشہ ور، کانوں پہ یہ پھول اٹکائے یا ہاتھ میں تھامے، البلا گھیلا پھرتا ہے اور چلتے پھرتے ناک سے لگا کر مشام جان کو معطر کرتا ہے۔

شہر سے ذرا دور کارتھیج کے کھنڈر ہیں لیکن ان میں کوئی خاص بات نہیں تاہم سیاح خلیج کارتھیج سے پرے جو پہاڑیاں ہیں ان کی سیر کرتے پھرتے ہیں وہاں پرانے زمانے کے پتھر دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں اور شہر کے آباد ہونے کی داستان یاد کرتے ہیں کہتے ہیں کہ خیدو نامی ایک شہزادی اپنے عملے کے ساتھ یہاں اتری اور شہریوں سے پوچھا کہ اجازت ہو تو ذرا آرام کر لوں۔ اس نے کہا کہ مجھے بسنے کے لیے اتنی جگہ دے دو جو گائے کی کھال کے برابر ہو۔ بربروں نے خوشی سے اجازت دے دی۔ اب ڈیڈو نے گائے کی کھال کے باریک ٹکڑے کئے اور ان کو اس طرح پھیلایا اور ایک دوسرے سے جوڑا کہ خاصی زمین گھیر لی۔ اس دائرے میں کارتھیج کا شہر تعمیر کیا گیا۔ اور سیدھے سادھے بربروں نے کبھی یہ کوشش نہ کی کہ اپنے عیار مہمانوں کو نکال دیں۔

کارتھیج کے کھنڈروں کے ساتھ ہی ایک گاؤں ہے جسے سیدی بو سعید کہتے ہیں۔ یہاں دنیا بھر کے مصنف اور مصور آ کر رہتے ہیں۔ اس گاؤں کی عمارتیں کم و بیش سب کی سب سپید ہیں۔ کناروں پہ نیلا رنگ ہے۔

اور دودھیا پلستر کے مقابلے میں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے نیلے نیلے پھولوں کے گلدستے رکھے ہوں۔

اس علاقے سے تاریخ کا ربط بہت پرانا ہے۔ کہتے ہیں کہ اٹلی میں پیسا کے مینار خمیدہ کی تعمیر میں کارتھیج کے پتھر استعمال کئے گئے تھے۔

۱۲۷۰ء میں یہاں لوئی نہم شہنشاہ فرانس کی وفات ہوئی جو مسلمانوں کے خلاف کئی صلیبی جنگوں میں شریک تھا اور جس نے کارتھیج پر چڑھائی کی تھی اب مقامی عرب اس عیسائی دشمن کو تعظیم کا سزاوار یعنی مرابط سمجھتے ہیں (بجمع مرابطین)۔

شہر مقدس، قیرواں

تیونس سے ہم قیروان پہنچا کہ شمالی افریقہ کا عربی شہر ہے اس کا بانی عُقبہ ہے۔ جو عربوں کی اس فوج کا کمانڈر تھا جو بحر اعظم کو عبور کر کے اوقیانوس کے ساحل تک جا پہنچی تھی۔ شہر کی تعمیر ۶۷۲ء میں ہوئی۔ پرانے شہر کے بیچوں بیچ بڑی عالیشان مسجدیں ہیں جن کے منارے اور گنبد نہایت حسین ہیں۔ یہ شہر اسلامی دنیا کا بہت محترم مقام ہے۔ یاد رہے کہ مراکش کے شہر فیض میں جو مسجد قیروانی ہے اس کا اس شہر سے کوئی تعلق نہیں ہے انگریزی کلمہ (CARAVAN[1]) کا تعلق اس شہر کے نام سے ظاہر ہے

---

[1] تحقیقات سے معلوم ہوا کہ بظاہر کارواں کا کوئی تعلق قیرواں سے نہیں ہے اور مصنف علامہ کو تشابہ ہوا ہے۔ امریکی محقق شپلے کا بیان ہے کہ کارواں کا دوسرا کلمہ وہی لفظ ہے جو انگریزی میں VAN ہے اگر کارواں مرکب ہے جیسا کہ

اس شہر کی سب سے جلیل القدر مسجد جامع عقبہ ہے اس کی فن کاری کا ڈھنگ بالکل نرالا ہے کہ سینکڑوں ستون ہیں اور کوئی ایک دوسرے سے نہیں ملتا۔ پھر عمارت کا کوئی جزو دوسرے جزو سے لگا نہیں کھاتا۔ البتہ سیاح حجام کی مسجد دیکھنے ضرور جاتے ہیں۔ پرانی روایات کے مطابق ایک صحابی رضؓ بھی یہاں دفن ہیں جنہوں نے مرتے وقت ہاتھ میں رسول پاک (صلعم) کی ریش مقدس کے تین بال بہ انتہائے عقیدت تھام رکھے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ بال آج تک اسی طرح محفوظ ہیں[2]۔

یہاں مسجدوں میں غیر مسلم بھی جا سکتے ہیں۔ تیونس کے لوگ کہتے ہیں کہ فرانسیسی زبردستی مسجد میں داخل ہو گئے تھے۔ اس کے بعد غیر مسلموں کے داخلے پر کوئی پابندی نہ رہی۔ کم از کم عیسائیوں کو تو عام اجازت ہے۔

یہاں کا بازار نہ تو مراکش کے بازار کی طرح چاروں طرف سے بند ہے، اور نہ اتنا دلکش۔ البتہ صاف ضرور ہے۔ گندم، سبزیاں اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں زمین پر نہیں رکھی ہوتیں، بلکہ ٹوکریوں میں یا چٹائیوں پر رکھی جاتی ہیں۔ یہاں کے غالیچے مشہور ہیں کہ نہایت اعلیٰ درجے کی اُون سے بُنے جاتے ہیں اور ماہر فن کار انہیں رنگ دیتے ہیں۔ تیونس کی حکومت ان فن کاروں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ یہ پرانا عربی الاصل فن

ظاہر ہے تو قیروان اور کاروان کا تعلق اور بھی مشکوک ہو جاتا ہے۔

تاریخ ماخذ لغات تالیف شپلے نیویارک (مترجم)

ؔ۲ یہ داستان محلِ نظر ہے۔

پنپتا رہے۔

قیروان کی ابتدائی تاریخ خون ریز جنگوں کی داستانوں سے پُر ہے قیروان کے فاتح اس عربی الاصل دارالسلطنت پر بہت نازاں تھے اور انہوں نے بڑے شوق سے محل، باغ اور جھیلیں بنوائیں۔ آج کل کے گائیڈ کہتے ہیں کہ کبھی یہاں جھیلوں میں فواروں سے گویا عطر ابلتا تھا اور شہزادے سنہرے اور راج ہنس کی شکلوں کے بجروں میں بیٹھ کر سیر کرتے پھرتے تھے۔

شہر کے باہر رومیوں کے وقت کے آثار کثرت سے ملتے ہیں۔ کنواں کھودیئے یا ہل چلایئے، اس وقت کے سنگ مرمر کے ٹکڑے ضرور ملیں گے۔ شام کو سیر کرنے نکلئے اور پرانے وقتوں کے اس مال غنیمت سے جیبیں بھر لیجئے۔ ہر پارۂ سنگ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ رومیوں نے تیونس میں بہت کچھ کر کے دکھایا تھا۔ انہوں نے زراعت کے لئے اور زیتون لگوانے کے لئے جو نقشے بنوائے تھے آج بھی حرف بحرف ان پر عمل کیا جاتا ہے۔

قریب ہی حمامہ نامی شہر ہے جسے رومی پٹ پٹ کے عجیب نام سے یاد کرتے تھے۔ یہاں کے خوبصورت اور دل کش باغوں میں بہت سے فنکار رہتے ہیں۔ اس سے ذرا فاصلے پر ساحلی شہر سادس ہے جسے رومی حدروم توم کہتے تھے۔ یہیں ۴۶ ق م میں سیزر اترا تھا کہ افریقہ کی مہم شروع کرے۔ وہ ساحل پہ اترا ہی تھا کہ اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اس کے ساتھیوں کا رنگ زرد پڑ گیا کہ شگون نحس تھا، لیکن سیزر نے زمین پر لیٹ کر مٹھی بھر ریت کو ہاتھ میں لے کر چوما اور کہا "افریقہ تو میری

مٹھی میں ہے"۔ یوں نحس شگون فتح مندی کے شگون میں بدل گیا۔

ساحل پر جنوب کی طرف سفیح نامی بندرگاہ جہاں سے زیتون کا تیل برآمد کیا جاتا ہے اس علاقے کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ غالیچے کی طرح ہے جس کے تین رنگ ہیں زمین کا خاکستری رنگ، زیتون کے تنوں کا نقرئی رنگ اور ان کے پتوں کا سبز۔ درختوں کی قطاروں کے درمیان جو روشیں ہیں ان پر گھاس کا نام ونشان بھی نہیں۔ زیتون کے درختوں کے سوا یہاں اور کسی چیز کی کاشت نہیں ہوتی کہ پانی کا ہر قطرہ اس مخزنِ ثروت درخت کے پھلنے پھولنے کے لئے درکار ہے۔ البتہ شہر میں جیسے رنگوں کا سیلاب نظر آتا ہے۔ باغوں میں انار اور پستے کے درخت ہیں، گلاب ہیں اور اس کے علاوہ طرح طرح کے پھول ہیں

تیونس کے ساحل پر جو شہر واقع ہیں وہاں کی رہائش بڑی مزیدار ہوتی ہو۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ان شہروں میں مسلسل ایسی گرم ہوا چلتی ہے کہ جھلسا کے رکھ دیتی ہے

تیونس کے جزیرے

ساحل کے پاس پاس کئی جزیرے ہیں اور ہر جزیرے کا رنگ نرالا ہے کئی جزیروں میں تو پہاڑی بکریوں اور وحشی خرگوشوں کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ یہی جانور پھول دار درختوں کے ہجوم میں کلیلیں کرتے نظر آتے ہیں۔

کچھ جزیرے ایسے ہیں جو کبھی بحری قزاقوں کے اڈے تھے ان میں سے دو یعنی زمبرا اور زمبرتا بہت مشہور ہیں۔ یہ گویا خلیج تیونس کے نگہبان ہیں اور آج یہاں قزاقوں کے جدید پیرو یعنی سمگلر اپنا کاروبار کرتے ہیں۔

زرا ادھر جنوب کی طرف رومیلایا نامی جزیرہ اونٹوں کے لئے مشہور ہے کہ یہاں ان کی تربیت کی جاتی ہے۔

تیونس کا سب سے دلکش جزیرہ دربہ ہے۔ اکثر مورّخ کہتے ہیں کہ ہومر نے جو کنول کے پھول کھانے والوں کی سرزمین کا ذکر کیا ہے وہ یہی ہے یہیں یولی سیس سات سال ٹھہرا رہا۔ ہومر لکھتا ہے کہ جو لوگ یہاں کا کنول کھا لیتے ہیں وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتے کہ اس پھول میں سے جو آبِ حیات نکلتا ہے۔ اسے پی کر انسان کو اپنا ماضی یاد نہیں رہتا۔ شاید ہومر کو معلوم نہ تھا کہ کنول کوئی خوش ذائقہ چیز نہیں ہے۔

آج اس جزیرے کے سفید، نیلگوں اور پیلے پیلے گھر زیتون اور دوسرے درختوں کے جھنڈ میں نہایت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں کے باشندے غالیچے بناتے ہیں اور گرم مصالحے تیار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہاں کے قالین باف سینہ بسینہ رنگ اور نقش کے خفیہ گُر اپنی اولاد کو بتاتے چلے آئے ہیں جو کسی اور کو معلوم نہیں۔

اس جزیرے میں بہت سے یہودی بھی صدیوں سے آباد ہیں اور یہیں ان کی نہایت مقدس ہیکل بھی موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی بنیاد ایک پتھر پر رکھی گئی ہے جو حضرت سلیمان کی ہیکل سے لایا گیا تھا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب بخت نصر نے اس ہیکل کو برباد کیا تھا۔ صدیوں سے یہودی اسے زیارت گاہ سمجھتے ہیں۔ تیونس کی طرح یہ چھوٹا سا جزیرہ بھی شمال جنوب اور مشرق مغرب کی اس تجارت کا مرکز ہے جو بحیرۂ روم سے مربوط ہے اور

تیونس ہی کی طرح بحیرۂ روم کی آباد دنیا کے وسط میں واقع ہے۔

تیونس کا مستقبل کیا ہوگا! اس کا جواب دینا مشکل ہے۔ لیکن یہ بات بآسانی کہی جا سکتی ہے کہ شمالی افریقہ کا یہ مُرَقّع ہمیشہ دلچسپی سے لبریز رہے گا۔ کارتھیج کی تعمیر کے زمانے سے لے کر اب تک یہاں تین براعظموں کے افکار تصوّرات اور ان کے باشندے باہم ملتے رہے ہیں۔ یعنی افریقہ یورپ اور ایشیا۔ آج بھی افکار و تصورات کا تال میل اور اختلاف کا عمل و ردّعمل جاری ہے

---

(۷)

الجزائر اور جنگِ آزادی

نومبر ۱۹۵۴ء میں الجزائر میں فرانس کی حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی پہلے بات معمولی تھی پھر صورت حال سنگین ہو گئی۔ مختلف علاقوں میں آٹھ فرانسیسی مارے گئے۔ دور افتادہ فوجی چوکیوں پر حملہ کیا گیا اور چھاؤنیوں کے راستے کاٹ دیئے گئے۔

پیرس کی مرکزی حکومت کو تعجب ہوا۔ مراکش اور تیونس میں انہی دنوں ہنگامہ برپا تھا اور فرانسیسی جانتے تھے کہ آزادی دیئے بغیر بات نہیں بنے گی لیکن الجزائر تو بالکل پُرامن اور محفوظ علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں الجزائر میں فرانس کا محض اقتدار نہ تھا، بلکہ سیاسی اعتبار سے یہ علاقہ فرانس کا ایک جزو تھا جیسے نارمنڈی یا برٹینی۔ الجزائر کے باشندے قانوناً ہر معنی میں فرانسیسی تھے جب انہوں نے فرانسیسیوں کو مارا تو گویا ہم وطنوں کو ہلاک کیا۔

یہی وجہ ہے کہ الجزائر کا ہنگامہ ایک ایسا حادثہ تھا جو حیران کن بھی تھا اور اضطراب انگیز بھی کہ خانہ جنگی سے مشابہ تھا۔ پیرس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ یہ عین اسی طرح ہے جس طرح امریکہ میں فورٹ سمٹر پہ حملہ ہوا تھا کہ پہلی گولی چلی تو ۱۸۶۱ء میں امریکہ کی خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ جب الجزائر کے لوگ فرانسی

کی غلامی سے آزاد ہونے کا مطالبہ کرتے تھے تو جواب ملتا تھا۔ "یہ ناممکن ہے" جس طرح کبھی واشنگٹن کی امریکی حکومت نے جنوبی ریاستوں کو جواب دیا تھا کہ انہیں آزادی نہیں مل سکتی اور وہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے نظام سے اپنے آپ کو خارج نہیں کر سکتے۔"

فرانس نے بغاوت کو کچلنے کا فیصلہ کیا۔ ہوائی جہازوں کے ذریعے بحیرہ روم کے اوپر سے اڑ کر چھاتہ فوج کے دستے الجزائر اترے اور ایک ہفتہ کے اندر فرانس نے اعلان کیا کہ بغاوت ختم ہو گئی۔

لیکن یہ بات غلط تھی۔ بغاوت کے شعلے پھر بھڑکے۔ ۱۹۵۷ء میں جبکہ یہ کتاب (اصل انگریزی کتاب) لکھی جا رہی ہے یہ شعلے روشن ہیں۔ آغازِ جنگ سے لے کر اب تک ہزاروں بچے، عورتیں اور مرد مارے جا چکے ہیں۔ ہزاروں کھیتوں کو آگ لگائی جا چکی ہے، عمارتیں گرائی جا چکی ہیں، کھڑی فصلیں برباد کر دی گئی ہیں۔ لیکن الجزائر کے اصلی باشندے آزادی حاصل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ادھر فرانس بھی اس بات پر تلا ہوا ہے کہ وہ الجزائر کا علاقہ جو فرانس سے چار گنا بڑا ہے اور فرانس کے مفاد کے لئے اس کا فرانس ہی کے زیرِ نگین رہنا ضروری ہے کسی طرح ہاتھ سے نہ دے گا۔

اس بغاوت کی داستان شمالی افریقہ کی تاریخ کا اہم باب ہے اور اس کی جڑیں الجزائر کے تاریخی کوائف اور اس کے باشندوں کے رجحانات میں پیوست ہیں۔

الجزائر

الجزائر کے ساحلی علاقوں میں آبادی بہت گنجان ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہیں کاشت ہو سکتی ہے۔ یہ علاقہ سارے خطے کا تین فی صد ہے اور آبادی کے بڑھنے کا تناسب یہ ہے کہ

ہر سال دو لاکھ پچاس ہزار نفوس کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی علاقے میں الجزائر کی نوّے لاکھ آبادی کی اکثریت آباد ہے۔ اس میں سے ساٹھ لاکھ عرب ہیں بیس لاکھ بربر، باقی یورپین، اور ان میں سے بھی اکثر فرانسیسی۔

بربری قبائل میں اہم ترین گروہ ان فخری ہیکل اور آزاد مزاج لوگوں پر مشتمل ہے جنہیں قبائلی کہتے ہیں۔ یہ بھیڑ بکریاں چراتے ہیں اور زیتون کے درخت کی کاشت کرتے ہیں۔ ان کا تمدن بڑا قدیم ہے۔ ساحلی علاقوں میں انکی آبادی اتنی گنجان ہے کہ بعض زمینداروں کے حصے میں زیتون کا ایک پورا درخت بھی نہیں آتا۔ یہ آپس میں شاخیں بانٹ لیتے ہیں۔

اسی طرح اور بربری قبیلے بھی ہیں جو شمالی افریقہ کے عام لوگوں سے بالکل مختلف ہیں مثلاً صحرا میں رہنے والے نیلگوں نقاب پوش توارغ اور معضبی۔

موخر الذکر مسلمانوں کے ایک متعصب گروہ کی یادگار ہیں۔ یہ الگ تھلگ رہتے ہیں۔ الجزائر سے جنوب کی طرف ۱۰۰ میل کے فاصلے پر ان کے پانچ بڑے بڑے قصبے ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑا غاردیا ہے جو ان کا غیر سرکاری دارالخلافہ ہے، انکا رنگ گورا ہوتا ہے۔ مذہبی عقائد میں یہ بڑے سخت گیر ہیں یہاں تک کہ ان کے نزدیک گانا سننا بھی منع ہے۔ ان لوگوں کو تجارت میں بڑی مہارت ہے۔

جب یہاں سے کارواں گزرا کرتے تھے تو ان کا دارالخلافہ تجارت کا مرکز تھا۔ ان کی کاروائی کا یہ عالم تھا کہ ایک ایکڑ بنجر زمین سے بھی بہت روپیہ

پیدا کرتے تھے ۔ آج بھی یہ لوگ ساحلی شہروں میں جا کر بنک کاری اور تجارت کرتے ہیں اور خوب دولت کمانے کے بعد لوٹتے ہیں اور پھر وہی پرہیزگاری اور زہد کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہیں ۔ ان میں سے کوئی وطن سے باہر مر جائے تو لاش کو تدفین کے لئے متعلقہ گاؤں ضرور بھیجا جاتا ہے ، چاہے اس کے لئے موٹر ہی کا انتظام کرنا پڑے ۔

الجزائر اور مراکش کی تاریخ مراکش اور تیونس سے مربوط ہے کہ ہمسایہ ملک ہیں یہاں یکے بعد دیگرے فنیقیہ والے ، رومی ، وینڈال ، عرب ، ہسپانوی اور ترک سبھی آئے اور اپنے نشانات چھوڑ گئے ۔ غالباً سبھی الجزائر کی شراب پیتے اور یہاں کے انجیر کھاتے تھے ، آج بھی اس ملک کی اہم ترین پیداوار یہی چیزیں ہیں ۔ اس کے علاوہ لوہا اور فاسفیٹ بھی پیدا ہوتا ہے ۔ حملہ آوروں نے اس ملک کو ایک سیاسی وحدت کی صورت کبھی نہ دی ۔ ترکی فرمانروا بھی جو الجزائر پر متصرف تھا کبھی کامل سارے علاقے پر اپنا اقتدار قائم نہ رکھ سکا اور نہ اسے مذہبی رہنما تسلیم کیا گیا ۔

۱۸۳۰ء میں فرانس کے پانچ جنگی جہاز الجزائر کی بندرگاہ میں داخل ہوئے ۔ ان دنوں بھی یہی صورت تھی کہ اس وسیع خطے میں عرب اور بربر بکھرے ہوئے آباد تھے اور ان میں اتحاد مفقود تھا ۔ یہاں تک کہ مذہبی یگانگت بھی نہ تھی ۔ الگ تھلگ زندگی بسر کرتے تھے ۔ فرانس نے اپنی نوآبادی قائم کرنے کے لئے دونوں کو یکے بعد دیگرے شکست دی ۔

جب فرانسیسی سپاہی الجزائر میں اترے تو بیس دن کی لڑائی کے بعد شہر

پر اُن کا اقتدار کاملاً قائم ہو گیا۔ الجزائر کے بحری قزاقوں نے تجارتی جہازوں سے کچھ فرانسیسیوں کو پکڑ کر انہیں ہلاک کر دیا تھا۔ جب فرانسیسی فوجوں کو فتح ہوئی تو وہ شہر میں اس دروازے سے داخل ہوئے جہاں ان فرانسیسی مقتولوں کے سر لٹک رہے تھے۔ اس کے بعد فرانس نے اس خطّے میں تہذیب کی برکتیں پھیلانی شروع کیں کہ ان کی واقعی ضرورت بھی تھی۔

ملک کے دوسرے علاقوں میں مدافعت نسبتاً سخت ہوئی۔ فرانسیسیوں نے کمک منگائی۔ دو نئی فوجیں آئیں جن میں سے ایک وہ مشہور فوج تھی جسے فارن لیجن کہا جاتا ہے اور جس میں تمام ملک کے لوگ رضا کارانہ بھرتی ہوتے ہیں۔ اس فوج کے اکثر سپاہی نہایت جنگجو اور ہر قسم کی مصیبتوں کے عادی تھے۔ انہیں سب چیزوں میں لڑائی ہی پسند تھی۔ ان میں سے اکثر وہ لوگ تھے جنہیں وطن میں مصیبتوں نے آن گھیرا تھا یا جو سزا سے بچنے کے لئے بھرتی ہو گئے تھے۔

دوسری فرانسیسی فوج جو الجزائر پہنچی اونٹ فوج کہلاتی تھی۔ اس فوج کے سپاہی نہایت تیز رفتار اور تربیت یافتہ اونٹنیاں کہاں دیکھی تھیں انہوں نے ان کی بے ڈھنگی چال اور عجیب و غریب وضع کو دیکھ کر پہلے تو مذاق اڑایا لیکن انہیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ صحرا میں صرف اونٹ ہی کام آتا ہے خاص طور پر جب شمالی افریقہ کے ایسے باشندوں کا تعاقب مقصود ہو جو صبا رفتار اونٹوں پر چڑھ کر صحرا کی طرف فرار ہو جائیں۔

الجزائر کے بعض قبیلوں نے فرانس کا سخت مقابلہ کیا۔ ایک جماعت

نے تو یہ کیا کہ اونٹوں سے کام لے کر اپنے آپ کو شہر متحرک میں تبدیل کر لیا۔ ان کی قیادت ایک جیالے شیخ کے سپرد تھی۔ یہ لوگ تیرہ سال تک بر سر پیکار رہے بعض قبیلے (اندرون ملک میں) اس کے بعد بھی فرانس سے لڑتے بھڑتے رہے

اس اثنا میں الجزائر کا شمالی حصہ سرکاری طور پر فرانس کا جزو قرار دیدیا گیا۔ نہ تو مراکش کی طرح یہاں کسی کو برائے نام سلطان بنایا گیا اور نہ یہ بہانہ کیا گیا کہ الجزائر کی حفاظت کی جا رہی ہے بلکہ (جیسے تیونس کی حفاظت کی جا رہی تھی) فرانس نے اعلان کیا کہ الجزائر ہر معنی میں فرانس کا حصّہ ہے۔ ساحل کے پہاڑی علاقے کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا (امریکی اصطلاح میں ریاست) اور ان کو وہی سیاسی اہمیت دی گئی جو فرانس میں ڈیپارٹمنٹ کو دی جاتی ہے۔ بتدریج یہاں کے رہنے والوں کو فرانس کے شہری قرار دیا گیا۔ انہیں یہ حق دیا گیا کہ فرینچ اسمبلی (پیرس) کیلئے نمائندوں کا انتخاب کریں۔ بعد میں اس ملک کے جنوبی حصے کو جو شمالی حصے سے بڑا تھا، علیحدہ کر دیا گیا۔ اس پر براہ راست فرانس کی حکومت نہیں تھی بلکہ یہ حصہ اب تک شمالی الجزائر کے ماتحت ایک نوآبادی تھا۔ پھر بظاہر احکام الجزائر سے صادر ہوتے تھے لیکن دراصل حکومت فرانسیسی فوج کے ہاتھ میں تھی۔

اب فرانسیسی آبادکار بھی ساحل پر اور ساحل کے آس پاس کے ہرے بھرے پہاڑی علاقوں میں آباد ہو گئے۔ یہ لوگ صحیح معنی میں پہلے آبادکار تھے نئی دنیا بسانے کے لئے یہ ایسے باحوصلہ لوگ آئے تھے کہ جنگل میں منگل ہو گیا تھا۔

ان آبادکاروں کی مشکلات کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ ان میں سے ایک

لکھتا ہے"۔ زمین کیا تھی دلدل تھی کہ پاؤں اس میں دھنس جاتا تھا۔ جدھر دیکھئے گھنی اور گنجان جھاڑیاں تھیں۔ لمبی لمبی گھاس کھڑی تھی۔ خاردار پودے تھے۔ چھوٹے چھوٹے کھجور کے درخت تھے۔ اس گھنے علاقے میں چلنے کا راستہ بھی مشکل سے ملتا تھا۔

سڑکیں تھیں ہی نہیں۔ کیونکہ ضرورت ہی نہیں تھی۔ باشندے گاڑیوں کے تصور سے بھی ناآشنا تھے اور اس خیال سے بھونچکے رہ جاتے تھے کہ تومند گھوڑوں کو گاڑیوں میں جوتا جائے۔ جو لوگ فرانس کی ٹھنڈی آب و ہوا کے عادی تھے، ان کے لئے گرمی ناقابلِ برداشت تھی۔ اس پہ بخار کی وبا۔ آبادکاروں کا تیسرا حصہ ہر سال بخار کی نذر ہوتا تھا۔ کچھ تو حوصلہ شکن حالات، کچھ مخالف باشندوں کا خوف، بہرحال پہلے پچاس سال میں تو سینکڑوں آبادکار واپس چلے گئے۔

انہی پچاس برسوں میں جو آبادکار جم کر بیٹھ گئے تھے انہوں نے ساحلی علاقوں کو ہرا بھرا باغ بنا دیا۔ اجناس، زیتون اور انجیر جہاز بھر کر فرانس بھیجے۔ ظاہر ہے کہ یوں بتدریج الجزائر کی زرخیز ترین زمین ان کی ملکیت بن گئی اور اور کیوں نہ بنتی کہ انہوں نے سائنس کے جدید طریقوں سے مدد لے کر اپنی زمین کو کاشت کیا تھا اور اسی طرح آب رسانی کا انتظام بھی نہایت معقول کیا تھا پہلے پچاس سال گزرے تو آبادکاروں کا کام آسان ہو گیا۔ اب صحتِ عامہ کے سلسلے میں مفید منصوبے بنائے گئے اور ان پہ عمل ہوا۔ ریلوں کی پٹریاں بچھائی گئیں اور کشادہ سڑکیں بنائی گئیں۔ آہستہ آہستہ الجزائر کے شہر ظاہری صورت

اور فضا کے اعتبار سے فرانسیسی شہروں سے مشابہہ ہو گئے

الجزائر میں فرانسیسیوں کے متعدد خاندان کئی پشتوں سے آباد ہیں۔ ان امریکی خاندانوں کی طرح جو ریاستہائے متحدہ امریکہ میں سو سال سے آباد ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ملک ہمارا بنایا ہوا ہے اور ہمارا وطن ہے۔ یہ فرانسیسی خاندان بھی اپنے آپ کو یہیں کے سمجھتے تھے۔ انہوں نے فرض کر لیا تھا کہ اب یہ خطہ تا ابد فرانس ہی کے قبضے میں رہے گا۔ وہ مزے کی زندگی بسر کر رہے تھے اور عربوں کی طرف سے بالکل غافل تھے۔

ادھر بہت سے عرب خاندان اور کچھ بربر بھی، خاص طور پر شہروں کے رہنے والے فرانسیسی لباس پہننے لگے تھے اور رہنے سہنے میں آباد کاروں کی تقلید کرنے لگے تھے۔ الجزائر کے شہروں میں شمالی افریقہ کا خاص لباس کم نظر آتا تھا ہاں جن علاقوں میں اصلی باشندے رہتے تھے ان کی اور بات تھی۔ عربوں کے بچے بچیاں حصولِ تعلیم کے بعد پیرس سے لوٹتے تھے تو عموماً فرانسیسی ہی بولتے تھے اور بالکل اپنے ہم جماعت فرانسیسیوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے، فرانسیسی اخبار پڑھتے تھے۔ فرانسیسی کھیل دیکھتے تھے، مختصر یہ ہے کہ بہت سے عرب فرانسیسی تہذیب میں جذب ہو کر رہ گئے تھے۔

عرب لڑکیاں، بالخصوص طالبات ننگے منہ پھرتی تھیں، کچھ لڑکیاں سودا سلف بیچتی تھیں اور یورپین گھرانوں میں ملازمت کرتی تھیں اور کچھ تو ہوٹلوں میں بے نقاب بے حجاب بیٹھی ہوئی نظر آتی تھیں۔

عرب کاریگر بھی فرانس جاتے تھے۔ کبھی وہیں رہ پڑتے تھے۔ کبھی

واپس آجاتے تھے۔ انہوں نے برس میں اپنی بستیاں آباد کرلی تھیں۔ جن شہروں میں کان کنی زیادہ تھی وہاں یہ لوگ خاصی تعداد میں مل جل کر رہتے تھے مثلاً شہر لیوی۔ اس تال میل سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ فرانس اور الجزائر کے روابط بہت خوشگوار ہیں بلکہ وہ دونوں ایک ہی ملک کے دو حصے ہیں۔

الجزائر کے رہنے والے یعنی وہاں کے اصلی باشندے حکومت کے نظم و نسق میں بظاہر برابر کے دخیل تھے کہ الجزائر سے جو نمائندے منتخب ہو کر فرینچ اسمبلی میں شریک ہوتے تھے ان کی نصف تعداد شمالی افریقہ کے اصلی باشندوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ مقامی اسمبلی کے ایک ایوان میں تو صرف الجزائر ہی کے نمائندے تھے دوسرے ایوان میں البتہ فرانسیسی بھی شامل تھے، لیکن یہ برابری اور مساوات محض کاغذی کارروائی تھی۔ دراصل فرانسیسیوں اور الجزائر والوں کے حقوق یکساں نہ تھے اور الجزائر والوں کو اس بات کا علم تھا۔

وہ جانتے تھے کہ آباد کاروں کو عرب مزدوروں کی ضرورت ہے کہ غیر تعلیم یافتہ ہیں اور اس لئے سستے مل جاتے ہیں فرانسیسی یہ نہیں پسند کرتے تھے کہ عرب ان کے دیوان خانوں میں داخل ہوں۔ جب عرب سنتے تھے کہ آباد کار انہیں ذلیل اور غلیظ کہتے ہیں تو ان کے دل کے زخم ہرے ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ الجزائر والوں کو اور تکلیفیں بھی تھیں۔

انتخاب آزادانہ فضا میں نہ ہوتے تھے۔ مجالسِ قانون ساز میں صرف وہ عرب جا سکتے تھے جو فرانس کے وفادار ہوں۔ ان نمائندوں کو خود فرانسیسی حقارت سے کٹھ پتلیاں کہتے تھے۔ سرکاری ملازمتوں میں بھی عربوں کا

تناسب بہت کم تھا۔

۲۔ آبادکار الجزائر کی کل مزروعہ زمین کے ½ حصے کے مالک تھے اگرچہ سب کے سب بہت باثروت نہیں تھے۔ ملک کی اقتصادی ثروت کا مدار شراب کی کشید پر تھا اور یہ کام صرف آبادکار ہی کرتے تھے۔

۳۔ بینکوں میں، جہازوں میں، کانوں میں، مقامی رسائلِ حمل و نقل میں، رفاہ عامہ کے اداروں میں اور اجناس کی کاشت میں فرانسیسی آبادکاروں کے حصے سب سے زیادہ تھے۔

۴۔ الجزائر کے اکثر باشندے بالکل قلاش تھے۔ شہروں سے باہر رہنے والے ساٹھ فیصد لوگ سرکاری طور پر مفلس کہلاتے تھے۔

۵۔ تعلیم کی اتنی کمی تھی کہ صرف دو فیصد مقامی آبادی لکھ پڑھ سکتی تھی ۱۹۵۲ء تک فرانسیسیوں نے عربوں کے مدرسوں کے لئے ایک پائی بھی منظور نہیں کی تھی۔

اِن باتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عربوں کی بغاوت کا پس منظر کیا تھا اور یہ تحریک جو دہشت پسندوں کے اِکّا دُکّا حملوں سے شروع ہوئی تھی کس طرح جنگِ آزادی میں تبدیل ہو گئی۔

بہت سے عناصر اور عوامل الجزائر کی جنگ آزادی میں مددگار تھے مثلاً سب جماعتیں، جن میں اشتراکی بھی شامل تھے، جنگِ آزادی میں شریک تھیں۔ جب ۱۹۵۵ء میں اِن جماعتوں نے چاہا کہ الجزائر کا معاملہ اقوامِ متحدہ کے سامنے رکھا جائے تو دوسرے عرب ملکوں نے تائید کی۔ لیکن فرانس نے

اس مسئلے پر بحث کرنے سے انکار کر دیا۔

فرانس کا مؤقف یہ تھا کہ کسی کو اس معاملے میں دخل دینے کا حق حاصل نہیں کہ یہ فرانس کا داخلی مسئلہ ہے۔ گویا فرانس کا کہنا یہ تھا کہ اگر الاسکا کی ریاست ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے علیحدہ ہونا چاہیئے تو کیا اقوامِ متحدہ کے سامنے یہ مسئلہ بحث کے لئے رکھا جائیگا؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے الاسکا اور باقی ریاستوں کو خود اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ الجزائر میں بھی یہی صورت ہے۔ اس لئے فرانس اور الجزائر کو مل کر دوسروں کی دخل اندازی کے بغیر یہ معاملہ نپٹانا چاہیئے۔ یہ دلیل بہت وزنی اور معقول معلوم ہوتی تھی لیکن یہ ضروری تھا کہ فرانس اس معاملے میں کاملاً نیک نیت ہو۔

امریکہ نے فرانس کی حمایت کی (کچھ تامل کے ساتھ مراکش اور تیونس کے سلسلے میں بھی امریکہ نے فرانس کی تائید کی تھی) چنانچہ الجزائر کے قوم پرست امریکہ کے سخت مخالف ہو گئے۔ وہ بہ نوکِ شمشیر آزادی حاصل کرنے پر تلے ہوئے تھے اور دوسرے عرب ممالک کی اعانت کے طالب تھے بلکہ انہوں نے بصراحت کہہ دیا تھا کہ ہم دنیا کے ہر گوشے سے مدد حاصل کریں گے اور اس میں روس بھی شامل ہے۔

ایک رہنما نے یہاں تک اعلان کیا کہ ہم نہ صرف روس سے توپیں اور گولہ بارود لینے پر آمادہ ہیں بلکہ ضرورت پڑی تو شیطان سے بھی مدد مانگی جائیگی۔

لفظی جنگ اور دہشت پسندی

جب فرانس نے الجزائر کے مسئلہ کو خود سلجھانے پر اصرار

رکھا تو درراصل بڑی ذمہ داری قبول کی کہ اس مسئلے کا حل کوئی آسان کام نہ تھا پہلے تو فرانس نے اصلاحات کے وعدوں سے قوم پرستوں کو پچکارنا چاہا لیکن اس پر آباد کار برہم ہو گئے کہ ہم سے طاقت اور دولت چھین کر عربوں کو دی جا رہی ہے۔

جب حکومت نے قوم پرستوں کو بزورِ شمشیر دبانا چاہا تو دہشت پسندوں کی بن آئی۔ عرب اور بربر حملہ آور عمارات کو تیزی سے آباد کاروں پر جھپٹتے تھے۔ کبھی کوئی کھیت جلا دیا۔ کہیں رسد کے قافلے کو لوٹا۔ کہیں ریل کی پٹری اڑائی کہیں بلوہ اور کہیں خون بہایا اور پھر یہ جا وہ جا۔ ان کارروائیوں سے فرانسیسی سپاہی اور آباد کار خوف زدہ ہو گئے۔

امریکی اخبارات میں ہر روز سرخیاں جمائی جاتی تھیں کہ الجزائر میں دہشت پسندوں کا زور برابر بڑھ رہا ہے، خونریزی جاری ہے، جانیں ضائع ہوتی رہیں۔ فرانس نے تین لاکھ فوج الجزائر میں لا کر بٹھا دی۔ الجزائر والوں کا جانی نقصان زیادہ ہوتا تھا۔ فرانسیسی بھی مارے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ سیاسی انتشار اور اقتصادی پراگندگی فرانس کے لئے بہت بڑی مصیبت بن گئی تھی۔ امریکہ ان باتوں سے براہ راست متاثر ہوتا تھا۔ ایک وجہ تو یہ کہ انسانیت کا تقاضا تھا کہ اس الجھن کو دور کیا جائے اور دوسرے یہ کہ فرانس اس صورت حالات میں مجبور رہا کہ الجزائر میں اپنی طاقت بڑھانے کے لئے یورپ سے اپنے فوجی دستے ہٹا لے۔ نتیجتہً نیٹو کو یعنی امریکی اور بین الاقوامی دستوں کو جو مغربی یورپ میں اشتراکیت کو دبائے رکھتے ہیں سخت ضعف پہنچا۔

ہمسایہ ملک تیونس اور مراکش الجزائر کے کوائف سے غیر متاثر کس طرح رہتے۔ جب ۱۹۵۶ء کے موسم بہار میں وہ آزادی حاصل کر چکے تو الجزائر کے مسئلہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ طبعاً چاہتے تھے کہ الجزائر کے مسلمانوں کو بھی آزادی ملے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب تک الجزائر میں فساد جاری رہے گا اس وقت تک فرانس کو تیونس اور مراکش میں فوجیں بٹھائے رکھنے کا بہانہ ملتا رہے گا۔ بہ الفاظ دیگر وہ بھی جانتے تھے کہ جب تک تیونس، مراکش اور الجزائر تینوں ملکوں میں امن وامان نہ ہو اس وقت تک ان میں سے کسی ایک ملک میں امن وسکون نہیں ہو سکتا۔

الجزائر کی جنگ آزادی کے جلا وطن رہنما اکثر قاہرہ میں بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ مصر کے انتہا پسند لوگ الجزائر کے قوم پرستوں کی کھلم کھلا مدد کرتے تھے۔ اس لئے فرانس نے طبعاً یہ سمجھا کہ کرنل ناصر الجزائر کے باغیوں کو شہ دے رہا ہے۔ گولہ بارود سے بھرے ہوئے جہاز مصر سے چل کر الجزائر کی بندرگاہوں میں لنگر انداز ہوتے تھے اور ناجائز درآمد کی ہوئی چیزیں جن میں روپیہ بھی شامل تھا ساحل پہ اتارتے تھے۔ فرانس کی برافروختگی کے باعث ایک سال بعد نہر سویز کا معاملہ الیا الجھا کہ بحرانی کیفیت پیدا ہو گئی گویا الجزائر کی بغاوت جو معمولی چیز معلوم ہوتی تھی اب اس کے اثرات واشنگٹن سے لے کر مشرق وسطیٰ تک محسوس کئے گئے۔

آیئے الجزائر اور اس کے پڑوسی ملکوں کو واپس چلیں۔ جب سلطان مراکش اور تیونس کے صابر وضابطہ رہنما حبیب نے دیکھا کہ معاملات بگڑتے چلے جا

ویسے یہاں تو انہوں نے دخل دینے کی کوشش کی۔ وہ الجزائر کے حامی تھے۔ لیکن فرانس سے سمجھوتا کرنا چاہتے تھے کہ خونریزی نہ ہو۔ انہوں نے الجزائر کے جلاوطن راہنماؤں سے بات چیت شروع کی کہ فرانس سے آبرومندانہ سمجھوتے کی کوئی صورت نکالی جائے۔ فرانس نے پہلے تو گفت وشنید سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ الجزائر کے باغیوں کو الجزائر کی نیابت کا کوئی حق حاصل نہیں۔

سلطانِ مراکش اور حبیب نے گفت وشنید جاری رکھی اور الجزائر کے پانچ راہ نماؤں کو دعوت دی کہ ان سے ملیں تاکہ وہ مفصل بات چیت کے بعد فرانس سے رابطہ قائم کر سکیں۔ یہ راہ نما رباط پہنچے اور پہلے سلطان سے بات چیت شروع ہوئی۔ خیال تھا کہ اس کے بعد حبیب سے گفتگو ہوگی کہ زیادہ اہم یہی مرحلہ تھا۔ اب قرار پایا کہ جب سلطان تیونس جائے تو پانچوں راہ نما وہاں پہنچ جائیں تاکہ سب لوگ جمع ہو کر معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کریں

یہ پانچوں راہ نما عازم تیونس ہوئے تو راہ میں فرانس نے انہیں جبراً اغوا کر لیا۔ ایسی اَن ہونی بات کبھی کاہے کو ہوئی ہوگی۔

ان راہ نماؤں میں سے ایک تو الجزائر کی "قومی آزادی کے محاذ" کا فوجی کمان دار تھا، دوسرا سیاسی امور کا ناظم، تیسرا یورپ میں الجزائر کے قوم پرستوں کا نمائندہ۔ یہ لوگ رباط سے تیونس تک بحری جہاز میں سفر کرنا چاہتے تھے۔ کہ الجزائر کے قریب ہی ان کے جہاز کو فرانسیسی بحری بیڑے کے ایک جہاز نے اپنی حراست میں لے لیا۔ اور یہ الزام لگایا کہ یہ لوگ ہتھیار سمگل کرتے آئے تھے۔ اب الجزائر کے راہ نماؤں کو مجبوراً دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ مراکشی میزبانوں نے ان کے لئے ہوائی جہاز کرائے پر لیا۔ اس کا ہوا باز فرانسیسی تھا لیکن کسی کو خیال بھی نہ تھا کہ کوئی گڑبڑ کی بات ہوگی۔ کہ جہاز سلطانِ مراکش نے طلب

رکیا تھا۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۵۶ کو صبح ہی صبح پہلے سلطان کا جہاز عازمِ تیونس ہوا۔ پھر الجزائر کے راہ نماؤں کا جہاز ماجرز کا نامی جزیرے پر اُترا کہ تیل بھر سکے۔ سہ پہر کو پھر پرواز شروع ہوئی اور خیال تھا ساڑھے تین گھنٹے بعد تیونس جا پہنچے گا۔ اس جہاز میں امریکی اخبار نیویارک ٹائمز کا نامہ نگار مس الیف برینڈی بھی تھا۔ اس نے الجزائر کے راہ نماؤں سے بات چیت کی اور اُس کا بیان ہے وہ خوش و خرم تھے اور مطلق کوئی مسافر نہ جانتا تھا کہ بحیرۂ روم کے اوپر پرواز کے دوران میں ہوا باز کو کوئی خفیہ پیغام ملا ہے۔

یہ پیغام الجزائر میں فرانسیسی فوجوں کے صدر مقام سے بھیجا گیا تھا۔ ہوا باز سے کہا گیا تھا کہ وہ تیونس کی بجائے الجزائر میں اترے۔ اس نے سازش میں خوشی سے شرکت کی اور سٹیوارڈس سے کہا کہ مسافروں کو بہلائے رکھو تاکہ سمت کا تغیر انہیں چونکا نہ دے۔ اب وہ سمندر پر چکر کاٹنے لگا اور جب تیونس پہنچنے کا وقت قریب آیا تو الجزائر میں اتر گیا۔

ٹائمز کا نامہ نگار کہتا ہے کہ کسی مسافر کو صحیح حالت کا علم نہ تھا۔ جب جہاز کے پہیوں نے زمین کو چھوا تو اندر کی بتیاں بجھا دی گئیں اور ہم نے دیکھا کہ جہاز کے پیچھے بکتر بند گاڑیاں جن کی روشنی بڑی تیز تھی، آ رہی ہیں اور ٹرکوں میں مشین گنیں لیے فرانسیسی سپاہی بیٹھے ہیں۔

مسافروں کو اب بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ الجزائر میں ہیں کہ ناگہاں ایک سپاہی ٹامی گن لے کر جہاز میں آیا۔ ظاہر ہے کہ بے چارے الجزائر کے راہ نما تو ایک

طرف، مراکش اور تیونس کے لوگ بھی سخت برافروختہ ہوئے کہ یہ کیا تماشا ہے، لیکن کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑی۔ مراکش کے ایک افسر نے کہا یہ ہوائی قزاقی ہے اور ایسی حرکت ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ سلطان نے کہا جن لوگوں نے مجھ پر بھروسا کیا تھا انھیں گرفتار کر کے فرانس نے میری شخصی توہین کی ہے۔ سلطان نے کہا کہ مجھے تخت سے اتار دینا بھی اتنا اہانت آمیز نہیں ہو سکتا۔ حبیب نے تیونس میں متعینہ فرانسیسی سفیر کو بلا کر تنبیہ کی کہ اب سارا شمالی افریقہ فرانس سے ٹکرائے گا۔ غرض اس طرح الجزائر سے فرانسیسی گفت و شنید کا خاتمہ ہو گیا۔

جبری اغوا کے نتائج اس میں کوئی شک نہیں کہ ان پانچ راہنماؤں کی گرفتاری سے الجزائر کے قوم پرست بہت بددل ہوئے کہ اب ان کی قیادت کرنے والا کوئی نہ رہا۔ فوج بے سردار کے رہ گئی۔ لوگ مایوس ہو گئے لیکن پھر بھی فرانس کے خلاف بغاوت جاری رہی۔

۶ نومبر سے ۲۶ نومبر تک اغوا کے بعد دہشت پسندوں نے اکتالیس فرانسیسی سپاہیوں اور اکتیس یورپی شہریوں کو ہلاک کیا۔ الجزائر کے ۶۹۸ آدمی کام آئے۔ یہ دن بلوہ، خونریزی، غارت گری اور لوٹ مار ہوتی تھی۔ نومبر کے اواخر میں حبیب نے اقوام متحدہ سے کہا کہ یہ قتل عام روکا جائے۔ اس زمانے میں تیونس اور مراکش سے فرانس کے تعلقات بگڑ گئے۔

گزشتہ واقعات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ الجزائر کی بغاوت کے نتیجے کتنے خوفناک نکلے۔ دو سال کی جنگ میں ۸۹۶ فارم اور ۲۲۹ مدرسے تباہ کر دیئے گئے اور بیس ہزار مویشی چرائے گئے۔ گیارہ ہزار دو سو چھتیس ایکڑ زمین

کی فصلیں برباد کر دی گئیں۔ ایک لاکھ سترہ ہزار پھل دار درخت اور ستیس لاکھ انگور کی بیلیں ضائع ہو گئیں۔ خونریزی، خونریزی کو جنم دیتی ہے۔ اب تک عملاً الجزائر میں شعلے بھڑک رہے ہیں (اب الجزائر آزاد ہو چکا ہے)۔

فرانسیسی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو یہ لوگ اپنے مال و دولت کی حفاظت کرنے پر مجبور تھے۔ پھر یہ بھی سچ ہے کہ انہوں نے الجزائر کو متمدن بنانے میں بڑا حصّہ لیا تھا۔ اگر مقامی آبادکار دور بین ہوتے اور پیرس کے قانون ساز قدامت پسند نہ ہوتے تو بغاوت کبھی کی رک گئی تھی اب کوئی نہیں جانتا کہ نتیجہ کیا نکلے گا

الجزائر کے تین شہر اور ایک افریقہ کا پھیپھڑا ہے۔ مدت تک الجزائر کے دیہات میں خونریزی کی گواہی دیں گے۔ ٹوٹتے ہوئے نل آب رسانی کا بگڑا ہوا انتظام ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، بارود سے اڑائی ہوئی ریل کی پٹڑیاں، یہ سب چیزیں زبانِ حال سے کہیں گی کہ یہاں کیا ہوا۔ فرانسیسی زمینداروں نے کاشت چھوڑ دی۔ کہ باغی پکی فصلوں کو تباہ کر دیں گے۔ البتہ ساحل کے بڑے بڑے شہروں میں تاخت و تاراج کے باوجود یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بہت زیادہ نقصان ہوا ہے

ان شہروں میں اہم ترین دارالسلطنت الجزائر جس کی آبادی تین لاکھ ہے۔ اس شہر کی دلچسپ تاریخ سے قطع نظر اس میں ایک بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ شہر بحیرۂ روم کے ساحل کے فرانسیسی شہروں کی طرح معلوم ہوتا ہے یہاں بہت سی چیزیں نظر آئیں گی جو فرانس کے اچھے شہروں میں نظر آتی ہیں۔ کشادہ بازار، بازاروں میں قہوہ خانے، بڑے سلیقے سے لگے ہوئے باغ، ارد گرد سیاہ لوہے کے جنگلے، ڈھلوان منسارڈ چھتیں، سڑکوں کے کنارے

خوب صورت کوشک، ہر طرف رنگین اشتہار، کتابوں کی دوکانیں، نفیس ریستوران۔ فرانسیسی کہتے ہیں کہ انسان کو جسم کا بھی دھیان رکھنا چاہیئے اور ذہن کا بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ شہر کے چہرے پر فرانسیسی پردہ ضرور ہے، لیکن اصلاً یہ عربوں کی ہی بستی ہے۔ نئے شہر کے پیچھے عربوں کے سپید سپید مکان ہیں جو سلسلہ وار تختہ تختہ بلند ہوتے چلے گئے ہیں۔ سب سے اونچے تختے کے کسی مکان میں کھڑے ہو کر کھڑکی میں جھانکئے تو معلوم ہوگا کہ ہم چھجے پر کھڑے ہیں اور کسی مشرقی سٹیج کا منظر دیکھ رہے ہیں جہاں زندگی جیسے الٹی پیٹتی ہے

اب الجزائر کا قصبہ پہلے کی طرح رنگین نہیں رہا۔ پرانے مکانوں کی جگہ نئی وضع کے فلیٹ اور بنگلے بن گئے لیکن پر اسرار اور تنگ و تاریک گلیوں میں سے گزریئے تو داستان سرا رنگین کہانیاں سناتے ضرور مل جائیں گے۔ یہیں مشہور ہسپانوی مصنف سروانتے رہتا تھا جو ڈان کوئیک سارٹ کا مصنف تھا۔ ہوا یہ تھا کہ قزاقوں نے اسے پکڑ لیا اور پانچ سال جبراً مقیم رکھا اور فدیہ لے کر چھوڑا۔

طلوعِ آفتاب کے بعد قہوہ خانوں میں بڑی رونق ہوتی ہے۔ لوگ چھوٹی چھوٹی میزوں کے گرد بیٹھے قہوہ یا دوسری مشروبات پیتے ہیں، مونگ پھلی ٹھونگتے ہیں اور چھلکے سڑک پر پھینک دیتے ہیں۔ رات کے آٹھ بجے تک یہ ہنگامہ رہتا ہے۔ پھر گلیاں سنسان ہو جاتی ہیں۔ شمالی افریقہ کے دوسرے شہروں میں رونق ہوتی ہوگی، لیکن الجزائر میں لوگ جلدی سو جاتے ہیں۔ شبینہ زندگی مفقود ہے۔

الجزائر کی بندرگاہ اوران بھی بہت مشہور ہے کہ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گردوغبار سے اٹی ہوئی ایک عربی بستی ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شہر یورپینوں کا ہے۔ اس میں مسلمان بہت کم ہیں ۱۵۰۱ء میں ہسپانیہ نے اس پر قبضہ کر لیا تھا جو دو سو سال تک قائم رہا۔ اسی لئے ہسپانوی رنگ چوکھا ہے۔ شمالی افریقہ میں اس شہر کے سوا سانڈوں کی لڑائی کا تماشا کم ہی نظر آتا ہے الجزائر کی مشہور شراب یہیں سے برآمد کی جاتی ہے

تیونس کی سرحد کے قریب اور ساحل کے پاس خشک میدانوں میں شہر کانسٹن ٹائن واقع ہے۔ کہ فنیقیہ والوں کے زمانے میں بھی مشہور تجارتی منڈی تھا۔ الجزائر کی تاریخ میں اسے ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں امریکی سپاہی یہاں بہت آتے جاتے تھے۔

یہاں جو چیز واقعی دیدنی ہے وہ ایک لمبی اور پانچ سو فٹ گہری اور اسی قدر چوڑی گھاٹی ہے جس نے شہر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے کانپتے ہوئے ہاتھ میں چھری لے کر زمین میں شگاف دیدیا ہو اور یہ شگاف سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا دور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ رومیوں کے وقت سے لے کر اب تک یہاں کے لوگ اس گھاٹی پر پل باندھتے رہے ہیں آج بھی یہاں بہت سے پل موجود ہیں۔ ایک پل تو عین اس جگہ ہے جہاں کبھی رومیوں کا بنایا ہوا پل تھا۔

شمالی افریقہ کے مشہور ترین رومی آثار دیکھنے مقصود ہوں تو جنوب کی طرف تمغاد نامی ایک مقام پر ملیں گے جو سو سال قبل مسیح میں تعمیر کیا گیا تھا۔

یہاں ماہرین آثار قدیمہ نے بہت سی عمارتیں برآمد کی ہیں تھیٹر، ایوان، کتب خانہ، حمام، مندر، یہ عمارتیں اُن سڑکوں کے کنارے واقع ہیں جن کے آثار اب بھی باقی ہیں چشم تخیل پرانے زمانے کے رومیوں کو اپنی افریقی آبادی میں بہ کمال تمکنت چلتا پھرتا دیکھ سکتی ہے۔ تمقاد میں اتنے آثار برآمد ہوئے ہیں کہ اس شہر کو اٹلی کے شہر پومپیائی سے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔

تمقاد سے ذرا اور آگے جنوب کی طرف صحرا شروع ہو جاتا ہے جو اس براعظم کے آدھے حصے میں پھیلا ہوا ہے ہر خطے میں صحرا کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن الجزائر میں سب سے زیادہ خطہ صحرائی ہے یہیں مشہور نخلستان بھی پائے جاتے ہیں مثلاً بسقرہ جسے روایتیں باغ عدن کہتی ہیں۔

الجزائر ہی میں صحرا کے دو ایسے حصے پائے جاتے ہیں جن میں سوائے ریت کے کچھ نہیں، یعنی مشرق کا ربع خالی اور مغرب کا ربع خالی ہیں صحرا میں وسیع ترین پہاڑی علاقے بھی موجود ہیں۔ ان میں سے ایک بستی الجمائر ہے۔ جہاں بہت اچھے میٹھے پانی کی جھیلیں ہیں جن میں مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔ دوسرا مقام ٹیلوں اور ریتانوں کا علاقہ ہے جسے ہوغر کہتے ہیں۔ یہاں نیلگوں نقاب پوش توارغ رہتے ہیں جن کا ذکر اگلے باب میں ملے گا۔

اگر کسی طرح صحرائی علاقوں کی آبپاشی ہو سکے اور یہ زرخیز ہو جائیں تو براعظم کیا دنیا کی تاریخ بدل جائے گی سالوں سے سائنس داں صحرا تک پانی پہنچانے کے منصوبے باندھ رہے ہیں، تحقیقات جاری ہے لیکن مشکلات نا قابلِ عبور معلوم ہوتی ہیں۔

صحرا میں پانی کو اہمیت حاصل ہے اور تیل کو بھی۔ تیل کے چشمے دریافت ہوئے ہیں اور امید ہے کہ بہت کثرت سے تیل نکالا جائے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحرائی علاقوں میں معدنیات بھی موجود ہیں۔ مثلاً تانبا، لوہا، یورینیم، ٹین اور کوئلہ تیل اور معدنیات کے سلسلے میں کامیابی ہوئی تو فرانسیسی مقبوضات کے تمام صحرائی خطوں کا انتظام کرنے کے لئے ایک نیا ادارہ قائم کیا جائے گا۔ اس ادارے کے ماتحت الجزائر کے صحرائی خطے ہی نہیں ہوں گے، بلکہ جنوب کی سمت فرانس کے افریقی مقبوضات بھی ہوں گے۔

—— اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرانس کو امید ہے کہ کسی دن اُسے الجزائر کے ساحلی علاقے سے نکال بھی دیا گیا (اگرچہ وہ بڑی بے جگری سے اس ملک کو مسخر رکھنے کے لئے لڑ رہا ہے) تو بھی صحرائی خطوں پر سو ہی متصرف رہے گا۔ اور ان سے متمتع بھی ہو گا۔

(٨)

صحرا

چاند تک پہنچنے کا اب مجھے اشتیاق نہیں رہا کہ میں چاند کی سیر کر چکا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے صحرا کے وسط میں آتشیں چٹانوں کا وہ حیرت انگیز سلسلہ دیکھا ہے جسے ہوغر کہتے ہیں۔ اسی مقام کو میں چاند کہتا ہوں کہ اس کا جاہ و جلال، بے گیاہ و بے رنگ، درحقیقت چاند کی یاد دلاتا ہے اور یہاں کی منجمد تنہائیاں چاند کی ٹھنڈی روشنی میں بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

کچھ درخت جو ملتے ہیں وہ بھی وادئ قمر کے اشجار سے مشابہ ہیں۔ یہ درخت بید کی ایک قسم ہیں، سبزی مائل سپید، جیسے جھاڑیوں پر کسی نے نقرئی اوڑھنی پھیر دیا ہو۔ یہ خاردار اور جھری دار جھاڑیاں اپنی نوک پلک میں تابناک بھی ہیں اور وحشت خیز بھی۔

اس مقام کی جغرافیائی کیفیت یہ ہے کہ لاکھوں سال ہوتے ہیں کہ صحرا کی زمین پھٹی اور آتش زیر زمین نے جیسے لاکھوں ٹن بلکہ کروڑوں ٹن مٹی اگل دی۔ یہ لاوا ابلا اور پھر منجمد ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں چٹانیں علیحدہ علیحدہ تنہا کھڑی ہیں اور کسی سلسلے کا جزو نہیں۔ ان کا وجود فطرت کے کسی

خوفناک حادثے کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے جس طرح ایٹم بم پھٹنے کے بعد کلاہ باراں کے بادل نمودار ہوتے ہیں دن کو سورج ان چٹانوں کا رنگ چاٹ جاتا ہے لیکن فجر اور شام کے وقت یہی سرخی مائل، زرد، سلیٹی، نیلگوں، ارغوانی، گلابی اور گہرے سرخ رنگوں میں نہا جاتی ہیں۔ رات کے وقت ان کے سروں کے اوپر تارے یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے چاندی کے بڑے بڑے گلدان۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ صحرا ناہموار ہے، گرم ہے اور اس میں ریت ہی ریت ہے یہ مقام سوئیزرلینڈ کی طرح ہموار ہے، اور سردیوں میں برف کی طرح ٹھنڈا ہو جاتی رہی ریت تو صحرا میں کئی دن سفر کرنے کے بعد مجھے ریت نظر آئی تو خوب نظر آئی ساتھ ہی میں نے سراب واقعتاً سراب بھی دیکھا۔

صحرا کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اس کا وصف بہ اختصار ناممکن ہے یہاں اتنے بڑے بڑے نخلستان ہیں کہ کھجور کے لاکھوں درخت نظر آتے ہیں اور ان میں نمی کی یہ حالت ہے کہ چپہ چپہ پانی سے لبریز معلوم ہوتا ہے۔ کچھ حصے اتنے گرم اور خشک ہیں کہ انسان عبور نہیں کر سکا۔ عربی میں صحرا کا مطلب خالی یا عدم ہے۔

پرواز

میں الجزائر سے پہلے ہوائی جہاز کے ذریعے تمانرسیت پہنچا جو صحرا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ جہاز ہفتے کے ہفتے جاتا ہے امریکہ میں ہم جس ہوائی سفر کے عادی ہیں اس کی صورت اور ہوتی ہے اس کی صورت اور تھی۔ جہاز پرانا تھا اور چھت پر سفید روغن تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سفید رنگ سورج کی شعاعوں کو منحرف کر دیتا ہے اور یہ بھی ہے کہ صحرا میں سفید رنگ خوب

عیاں معلوم ہوتا ہے۔ کوئی جہاز گر پڑے اور دوسرے جہاز اس کی تلاش میں نکلیں تو سفید رنگ جلدی پہچانا جاتا ہے۔ بسوں اور موٹروں کی چھتوں کے رنگ بھی سفید ہوتے ہیں۔

سردیوں کی ایک طوفانی اور بارانی صبح تھی کہ ہم پونے پانچ بجے الجزائر سے چلے۔ جہاز کے آدھے حصے میں سامان تھا جسے چمڑے کے تسموں سے جہاز کے کناروں اور دھات کے فرش سے باندھ دیا گیا تھا۔ قاعدہ ہے کہ اس راستے پر جو مغربی صحرا کی شہ رگ کا کام دیتا ہے ہوائی جہاز نخلستان سے نخلستان تک اڑان بھرتا ہے جیسے گالف کا گیند ایک سبزہ زار سے دوسرے سبزہ زار تک۔

جب ہم الغعلی پہنچے کہ دو گھنٹے کے سفر کے بعد پہلے یہیں ٹھہرنا تھا تو سورج اس طرح چمک رہا تھا جیسے افق میں ایک بہت بڑا پیلے رنگ کا سوراخ کیا جا رہا ہو۔ سردی سے میرے ہاتھ ٹھٹھرے جاتے تھے۔ ہم ایک ریت کے نشان زدہ حصے پر اترے اور میں نے دیکھا کہ اسباب کشتم پشتم ..... اتارا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ یہاں جہازوں کے اترنے کے لئے امریکہ کی سی کشادہ شاہراہیں (رن وے) نہیں ہوتیں۔ جہاز جو ہفتے کے ہفتے آتا ہے، شہر کے لوگوں کے لئے ایک تماشا بن جاتا ہے۔ عرب قبائیں پہنے چپ چاپ لیٹے دو آنکھوں سے ہماری طرف دیکھتے کہ یہ قصہ کیا ہے۔ فرانسیسی سپاہی جہاز کے عملے سے باتیں کرتے تھے، اخبار، ٹماٹر، ڈھیر سا مکھن، یہ چیزیں اتاری جا رہی تھیں۔

جو سپاہی باتیں کر رہے تھے ان میں سے کچھ صفاد کہلاتے ہیں۔ یہ ان کا رنگا رنگ لباس دیدنی تھا۔ پہلے یہ کلمہ جس کی اصلی بربر کی زبان ہے الجزائر کی پیدل فوج

کے اُن دستوں کے۔ یہ استعمال کیا گیا تھا جو اپنی رنگا رنگ یونیفارم پہن کر بڑے بانکے معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے جو لوگ ہوائی اڈے پر باتیں کر رہے تھے اُن کا لباس یہ تھا نیلے رنگ کی فوجی ٹوپیاں جن کے اوپر کا حصّہ بالکل ہموار تھا۔ کھلی کھلی کالے رنگ کی پتلون، دیسی چپلی جن کا رنگ گہرا سرخ، سنہری، ہلکا نیلا یا قرمزی تھا۔ انگوٹھے چپل سے باہر نکلے رہتے تھے۔ ہم اپنی منزلِ مقصود پہ پہنچنے سے پہلے دو جگہ اور ٹھہرے یعنی ادرار اور رالوٹ جو سنسان سے مقام تھے۔ شام کو تمانرسیلہ پہنچ گئے۔

تمانرسیلہ۔ شہرِ خاموش

یہ شہر دُنیا کے وسیع ترین صحرا کے وسط میں واقع ہے اور جونہی میں موٹر سے اُترا ایسا معلوم ہوا جیسے صحرا کے خلا نے مجھے نگل لیا ہے۔ ایسی چپ اور خاموش جگہ میں نے کبھی دیکھی ہی نہ تھی کہ پتا گرے تو پٹاخہ چھٹتا معلوم ہوتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دُنیا کی حدود سے باہر آ گئے ہیں

میں جس مہمان خانے میں ٹھہرا وہ گارے کا بنا ہوا اور سرخ رنگ کا تھا، جیسے نیومیکسیکو میں اکثر عمارتیں ہوتی ہیں۔ اس کا رنگ البتہ زیادہ گہرا تھا۔ اکثر عمارتوں کی وضع ایسی ہوتی ہے کہ انسان گرمی سے بچا رہے۔ موٹی موٹی دیواریں چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں، گھروں نہ آتش دان ہیں نہ آگ کا اور کچھ انتظام۔ صحرا میں لکڑیاں پلاٹینم سے زیادہ قیمتی ہیں۔ سردیوں میں یہ گھر یخ بستہ ہوتے ہیں۔ بیرونی دیواروں میں جالی کا کام نظر آتا ہے۔ یہاں بھی گارا استعمال کیا جاتا ہے

ستون سیدھے سادھے ہوتے ہیں جیسے کسی بچے نے کاغذ کی تصویریں کاٹی ہوں مٹی کی دیواروں پر کہیں کہیں گڑھے نظر آتے ہیں۔ یہ معمار کی انگلیوں کے نشان ہیں جس سے گارے کو تعمیری صورت بخشی ہوتی ہے۔

مینہ برسے تو مٹی کے یہ گھر بہہ جاتے ہیں۔ خزاں کے دنوں میں باد و باراں کے طوفان بھی یہاں آتے ہیں اگرچہ اس شہر میں ایک بار سات سال تک سرے سے مینہ ہی نہ برسا۔ شہر کے مکان سطح بحر سے ایک میل کی بلندی پر واقع ہیں اور اگست میں ٹمپریچر سائے میں بھی ۱۲۶ ہو سکتا ہے۔ جن دنوں میں وہاں تھا دن کو سخت گرمی اور رات کو سخت سردی پڑتی تھی۔ تمانراسیت میں زندگی سانپ کی طرح بل کھاتی ہے۔ دوپہر اور رات کے درجۂ حرارت میں ۷۰ درجے کا فرق ہو سکتا ہے۔ یہ شہر الجزائر کے شمالی اضلاع کا دارالخلافہ ہے۔ آبادی دو ہزار اور بازار ایک ہے۔ نہ کوئی بینک نہ اخبار، نہ ٹیلیفون، اور نہ نہانے کے نل۔ بجلی رات کو چھ سے نو بجے تک مہیا کی جاتی ہے۔ یہاں کی دوکانیں بھی عجیب و غریب تھیں۔ جیسے جن گھڑی کے غار ہوں، اور اتنی تاریک کہ سامان مشکل سے نظر آتا ہے۔ اور سامان کیا تھا! تالے، کپڑے کے ٹکڑے اور کنگھیاں۔ میں جب خاموش بازار سے گزرا تو ہر راہگیر نے فرانسیسی میں مجھے سلام کیا۔ مقامی سوداگر معضبی ہیں کچھ عرب بھی رہتے ہیں جو فوج میں ہوا کرتے تھے۔ باقی سب حبشی ہیں۔ یہ حبشی کچھ دنوں پہلے تک غلام تھے اور ابھی تک ان میں کچھ یہی چاہتے ہیں کہ پھر غلام ہو جائیں کہ روزی کمانے کے لئے سڑکوں پر پتھر کوٹنا مشکل ہے اور بن تنخواہ کے آقاؤں کے گھر میں کام کرنا آسان ہے۔ جب فرانسیسیوں نے حبشیوں

کو آزاد کیا تو اکثر غلام آقا کا گھر چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئے! انھیں حقارت سے دیکھتے ہیں لیکن سلوک اچھا کرتے ہیں۔ میں نے ایک عرب لڑکے کو کسی کام کے لیے بھیجا اور کچھ دینا چاہا تو بڑے غرور سے بولا "میں کوئی حبشی ہوں"۔

شہر میں ایک ہوٹل بھی ہے جس کی وضع فرانسیسی ہے اور کچھ گز ہی پر ایک پرانی کاروان سرا ہے جہاں لوگ اپنے اونٹ ساتھ باندھ کر صحن میں سوتے ہیں۔ اس شہر میں کچھ مناظر قابل دید ہیں ایک تو کوہ لاپرین ہے جو صرف گیارہ سو فٹ بلند ہے لیکن جس پر چڑھنا مشکل اور خطرناک ہے کہ اس کی ڈھلانوں سے لاوے کے ٹکڑے ٹوٹتے رہتے ہیں یہ وحشت خیز سرخ کوہ ایک فرانسیسی جرنیل کے نام سے منسوب ہے جو صحرا کے پیچ و خم سے آگاہ تھا۔ ۱۹۳۰ء میں جس ہوائی جہاز پر وہ سفر کر رہا تھا وہ اس سنسان مقام کے قریب گر پڑا۔ بچارا جرنیل زخموں اور پیاس سے مر گیا۔ تمانرسید کو کبھی قلعہ لاپرین کہتے تھے۔ اور بعض نقشوں میں یہ نام اب بھی ملتا ہے۔ ایک اور مقام جو دیدنی ہے وہ برج ہے جہاں فرانسیسی، افریقہ کے ایک مرد شجاع فوکالڈ نے سکونت اختیار کی تھی یہ شخص فوج میں ملازم تھا لیکن بے پروا اور سرکش تھا۔ خاندان کے لوگ پریشان تھے کہ کیا کریں کہ وہ تنہا صحرائی تنہائیوں میں جا کر دین و دنیا کے معاملات پر سوچ بچار کرنے بیٹھ گیا اور ایک مذہبی جماعت کی بنیاد رکھی جو "اخوان قلب مقدس" کہلاتے ہیں جس دن وہ فوج سے فارغ ہو کر ساتھ رہا نہ صرف انہیں مشورہ دیتا تھا بلکہ اپنی ساری دولت ان کی ضرورت کی چیزوں کے لئے صرف کرتا تھا۔ سوئی سے لے کر دوا تک وہی خرید کر

دیتا تھا۔ سن ۱۸۱۱ء میں ایک قبائلی جنگ جو چھڑی تو فو کا اثر ملا گیا۔ اس کا مذہب اب تک باقی ہے اگرچہ اس کی جماعت کے ارکان اب کم ہیں۔

نیلگوں نقاب پوش توارغ

تمانزسیلہ کے گرد و نواح میں توارغ آباد ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ لوگ خانہ بدوش ہیں اور اگر بے وطن لوگوں کا دارالسلطنت ہو سکتا ہے تو تمانزسیلہ ان کا دارالسلطنت ہے۔

توارغ کے کوائف اس لئے بھی بہت حیرت انگیز ہیں کہ یہاں عورتیں نہیں مرد نقاب پوش ہیں۔ یہ نقاب گہرے نیلے رنگ کے ہوتے ہیں اور نیل جو چھٹتا ہے تو مردوں کی جلد بھی نیلی ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ آنکھوں کے گرد خود نیل سے حلقے بناتے ہیں۔ جب یہ لوگ سفید کلاہ پہنے نیلی قباؤں اور نقابوں میں لپٹے بلند بالا اور وجیہ چلتے پھرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سائنس کی ترقی کے متعلق جو کہانیاں لکھی جاتی ہیں ان کے مسلح خود پوش کردار ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ سپید نوکوں والی نیلی گولیاں ہیں۔

مجھے اس سوال کا صاف جواب نہ مل سکا کہ یہ لوگ نقاب کیوں پہنتے ہیں۔ شاید اس کی ابتداء یوں ہوئی ہو کہ لڑائیوں میں زخمی ہونے کے بعد اپنے زخم چھپا لیں کہ بہت جنگ جو ہیں یا شاید بیرحم سورج کی گرمی سے بچنا مقصود ہو۔ کسی سے پوچھئے تو وہ کہے گا کہ یہ رواج اتنا پرانا ہے کہ اس کی توجیہ مشکل ہے۔

یہ لوگ کھاتے پیتے ہوں، خیموں کے باہر ہوں یا اندر ہر وقت نقاب پہنے رکھتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی لڑائی میں مارا جائے اور اس کا نقاب اٹھ جائے تو اس کے دوست اسے پھر نقاب پہنا دیتے ہیں تاکہ

پہچانا جا سکے کہ قریب ترین دوست بھی چہرے سے نہیں وضع قطع سے اپنے دوستوں کو پہچانتے ہیں۔ ان لوگوں کو حسب نسب بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن غالباً یہ بربر ہیں فرق یہ ہے کہ جو زبان لکھتے اور بولتے ہیں۔ وہ تماشک کہلاتی ہے۔ اس زبان کے حروف عجیب و غریب ہیں اور حروف علت سرے سے ہیں ہی نہیں۔ میرا نام اس زبان میں یوں لکھا جائے گا۔

KI+:　　*I

GNTR　　JN

ان لوگوں میں دو جماعتیں ہیں۔ امراء اور پیش خدمت۔ امراء کی پہچان یہ ہے کہ وہ کوئی کام نہیں کرتے۔ جب تک فرانسیسی یہاں نہیں پہنچے تھے ان کا کام یہی تھا کہ لڑتے بھڑتے تھے، دھاوا بولتے تھے، مویشی ہانک لے جاتے تھے اور غلاموں کی تجارت کرتے تھے۔ پیش خدمت گھر کا اور باہر کا سب کام کرتے ہیں اور اُن میں سے کوئی کبھی امراء کی صف میں شامل نہیں ہو سکتا۔

آج امراء بھی مفلس ہیں اور بڑی کفایت شعاری سے کام لیتے ہیں بکریں اور اونٹ لے کر چراگاہوں میں پھرتے ہیں اور انہی پر ان کی معاش کا مدار ہے۔ اونٹ کا دودھ پیتے ہیں اور فرینہ کھاتے ہیں جو نفیس دال کی قسم کی جنس ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ چمچوں سے کھاتے ہیں۔ یہ لوگ صاف ستھرے صحت مند اور پابند قانون ہوتے ہیں۔ کبھی روپے کی ضرورت پڑتی ہے تو قریب ترین شہر میں جا کر ایک اونٹ بیچ ڈالتے ہیں اور وہ بھی قصاب کے ہاتھ۔

اُن کے پاس جو تلواریں ہیں وہ پرانی وضع کی ہیں۔ از منہ وسطیٰ میں صلیبی

لڑائیوں کے جنگ آزما ایسی ہی تلواریں لے کر نکلتے تھے۔ اسی لیے یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ یہ لوگ شاید کسی عیسائی نائٹ کی اولاد ہیں جس نے صحرا پہنچ کر کسی بربری عورت سے شادی کر لی تھی۔ میں نے یہ تلواریں تو دیکھی ہیں لیکن بارہ سنگھوں کی کھال کی ڈھالیں نہیں دیکھیں۔ یہ اب نایاب ہیں کہ توارغ نے لڑنا لڑانا اور دھاوے بولنا کم و بیش ترک کر دیا ہے

کلاڈ بیلیگو ٹرلو نامی ایک فرانسیسی نے مجھے چند توارغ سے ملوایا جس نے ان لوگوں کے رہن سہن کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ میں اس شخص سے بہت متاثر ہوا یہ شخص تمانرسید مدرس تھا اور اسی نے خانہ بدوش کے تصور کو عملی جامہ پہنایا۔ اُسے یہ دُھن تھی کہ ان لوگوں کو لکھا پڑھا دے۔ اس لیے وہ ایک قبیلے کے ساتھ سارا سال رہتا تھا اور بچوں کو تعلیم دیتا تھا۔ یوں کہہ لیجئے کہ شتر سوار مدرسہ قائم کر دیا تھا یہ نظام تعلیم ایسا کامیاب ہوا کہ ہوغر کے خطے اور فرانسیسیوں نے بھی یہی کام کرنا شروع کر دیا اور اب یہ طریقہ خوب رائج ہے میں اس ذہین معلم کے ساتھ توارغ کی ایک جماعت سے ملنے گیا۔

خوش قسمتی سے شہر کے قریب ہی کچھ توارغ امرا رخیمہ زن تھے ہم ٹرک میں بیٹھ کر اُن سے ملنے گئے ہمارے ساتھ دو توارغ امرار تھے جو رہنمائی کر رہے تھے انہوں نے پیش خدمتوں کے ساتھ اونٹ تو واپس بھیج دیئے لیکن خوبصورت زینیں ٹرک میں رکھ لیں۔ ان زینوں کے ہرنے لمبی لمبی تلواروں کے دستوں کی طرح تھے۔

انہوں نے کوئی امریکی نہ دیکھا تھا لیکن نیویارک کا نام سُنا تھا۔ انہوں

نے کہا کہ ہم جانتے ہیں یہ شہر سمندر پار ہے، وہاں اونٹ نہیں چلائے جاتے اور اس شہر جتنا بڑا ہے وہ دس ہزار کی آبادی سے زیادہ کے شہر کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے

پہلے تو ہم ایک کچی سڑک پر سفر کرتے رہے جس پر بجری بھی ہوتی تھی اس کے بعد راستہ ایسا ملا کہ سرخ سنگِ خارا سے پٹا پڑا تھا۔ ساتھ ہی پیلے پیلے رنگ کی خاردار جھاڑیاں بھی تھیں بکریاں نظر آئیں تو ہمیں یقین ہوا کہ منزل قریب ہے۔ پھر ناگہاں سفید اونٹوں کی قطار نظر آئی کہ سُرخ سی پہاڑی کو اپنا پس منظر بنائے ہوئے ایسی خوبصورت معلوم ہوتی تھی کہ کیا کہیئے۔ اب ہم تو ارغ کے خیموں تک جا پہنچے تھے۔

ہمیں اس خیمے میں بٹھایا گیا جو مہمانداری کے لیئے مخصوص ہے۔ اس کا چمڑا تانبے کے رنگ کا تھا دونوں طرف بانس تھے۔ شامیانے کے نیچے زمین پر سرخ رنگ کا غالیچہ بچھا تھا۔ ہم آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور ہمارے میزبان جھاڑ جھنکار سے کام لے کر آگ جلانے لگے کہ چائے بنائیں۔

عورتیں جو بے نقاب تھیں اور نیلے رنگ کی قبائیں پہنے تھیں وہ پہلے تو سہمی سہمی سی دور دور رہیں۔ لیکن اشتیاق جو بڑھا تو قریب آگئیں۔ میرے گلے میں چمڑے کی ایک واسکٹ تھی لوگ اس کا زِپ دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے کہ واسکٹ کس طرح کھلتی اور بند ہوتی ہے۔ ایک ایک کر کے ہر شخص نے زِپ سے واسکٹ کھولی اور بند کی۔ ساتھ ہی چمڑے پر ہاتھ پھیرا کہ واہ واہ کیا نرم اور تابع حکم چمڑا ہے۔

پہلے ہمیں اونٹ کا ملائی والا دودھ پلایا گیا۔ سب نے ایک ہی کاسے سے منہ لگا کر پیا۔ پھر چائے پیش کی گئی۔ اس کی صورت یہ تھی کہ چھوٹی سی چائے دانی سے پیالوں میں اوپر سے چائے انڈیلتے تھے۔ بیچاروں نے بڑی محنت سے بنائی تھی کہ آگ کم تھی۔ ہم نے مہمانداری کے دستور کے مطابق تیز اور میٹھی چائے کے تین تین پیالے پیے۔ کوئی مہمان چائے یا کافی کے ایک یا دو پیالے پیئے تو اس نے میزبان کی اہانت کی کہ چائے بامزہ نہیں۔ تین سے زیادہ پیئے تو اپنی اہانت کی کہ پیٹو ہے۔

تو ارغ باتیں کرتے رہے اور مدرس ترجمانی کرتا رہا۔ باتیں کیا تھیں؟ وہی جو امریکہ کا زمیندار کرتا ہے یا برطانیہ کا چرواہا۔ فصلوں کی حالت، چیزوں کی قیمت، موسم، مقامی واقعات کے متعلق گپ شپ۔

چند ہفتے پہلے بلینکو پرو نے صحرا میں جا کر قبیلے کے منتخب سردار کی آواز کا ریکارڈ بھرا تھا۔ سردار نے آواز بھرنے والی مشین کی قیمت پوچھی تو یہ سن کر بیچارا سُن ہو گیا کہ چار اونٹوں کو بیچ کر خریدی جاتی ہے۔ ہم چائے پیتے رہے اور مدرس مشین کی کہانی سنا کر سامعین کو محظوظ کرتا رہا۔

اس کے بعد ہمارے میزبانوں میں سے ایک کہنے لگا کہ میں تمہیں تمہاری تقدیر کے کوائف بتاتا ہوں۔ اس نے ریت پر پیچیدہ سی لکیریں کھینچیں اور اپنی سمجھ کے مطابق پیش گوئیاں کیں۔ میں نے سب کو سگریٹ پیش کئے سب نے لے لئے لیکن علیحدہ علیحدہ رکھ دیئے کہ یہ لوگ نہ تو عورتوں کے سامنے کھاتے ہیں نہ تمباکو پیتے ہیں اور نہ روپیہ لیتے ہیں۔

جب ہم چلنے لگے تو ایک عورت کو اپنی موٹر میں بٹھالیا جو کچھ میل دور پیشی خدمتوں کے خیموں میں جانا چاہتی تھی ۔ اس نے عمر میں پہلی بار موٹر دیکھی تھی ۔

کار کے ذریعے صحرا کا سفر

آیا تھا ہوائی جہاز کے ذریعے ۔ لیکن یہاں پہنچ کر طے کیا کہ شمال میں الفولی کے نخلستان تک کار میں جاؤں گا ۔

کار کے ذریعے صحرا کا سفر بہت دلچسپ ہے ۔ آسان راستے اختیار کیجئے تو بھی بہت احتیاط کرنا پڑتی ہے اور قواعد کی پابندی لازم آتی ہے ۔ میں جس راستے پر عازم سفر ہونے والا تھا ، اسے شاہراہ تو کسی طرح بھی نہیں کہا جا سکتا یہ راستہ شمال سے جنوب کی طرف جاتا ہے ۔ صحرا کی حیرت انگیز وسعت کو طے کرنے کے صرف دو ہی راستے ہیں ۔ دونوں کا رخ شمال سے جنوب کی طرف ہے ۔ مشرق سے مغرب کی طرف کوئی راستہ ہے ہی نہیں ۔

جو مسافر اپنی کار میں صحرا کو عبور کرنا چاہتا ہے وہ عہدہ داران مجاز کو اطلاع دیتا ہے کہ میں فلاں راستہ سے سفر کروں گا ۔ اب راہ میں جتنے گاؤں پڑتے ہیں ریڈیو کے ذریعے (تار تو ہے ہی نہیں) وہاں اطلاع دیدی جاتی ہے مسافر کسی گاؤں یا قصبے میں وقت پر نہ پہنچے تو فوراً ایک اور کار بھیجی جاتی ہے کہ اس کی مدد کرے ۔

خوراک کے علاوہ ہر مسافر بیلچے ، تار کی جالی ، بالٹیاں اور رسی لیکر چلتا ہے ۔ گاڑی ریت میں دھنس جائے تو بیلچے اور تار کی جالی سے کام لیا جائے گا کہ جالی پہیوں کے نیچے بچھا دی جائیگی تاکہ مزید نہ دھنس سکے ۔ پانی ختم ہو جائے تو

رسی اور بالٹی کام آئے گی۔ رسی لمبی ہونی چاہیئے کہ مسافر اس لئے بھی پیاسا مرتا سنا گیا ہے کہ پانی کی سطح تک پہنچنے کے لئے رسی نہیں تھی۔

اب جو کاریں زیادہ آنے جانے لگی ہیں تو باشندے بے پرواہ ہو گئے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ پانی نہ لایا موٹر ریت میں دھنس گئی تو کوئی نہ کوئی اور کار ادھر آ نکلے گی۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ کبھی کار وقت پر پہنچتی ہے، کبھی نہیں پہنچتی۔

یورپین اب صحرا میں کھو نہیں جاتے کہ قانون کے مطابق احتیاطی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ لیکن حادثے ہو کر رہتے ہیں۔ میرے پہنچنے سے پہلے سردیوں کے موسم میں ایک انگریز شہر کے جنوب کی طرف سفر کرتا ہوا ہلاک ہو گیا تھا

فرانسیسی کہتے ہیں کہ گرمیوں میں جو آدمی صحرا میں کھو جائے وہ پانی کے بغیر بارہ تیرہ گھنٹے زندہ رہ سکتا ہے۔ مگر ایک دن کی دھوپ ہلاکت کے لئے کافی ہے۔ امریکی ہوائی بیڑے نے صحرائی کوائف کا جائزہ لے کر اپنے ہوابازوں کے لئے کچھ ہدایات جاری کی ہیں کہ جہاز گر پڑے یا مجبوراً اترنا پڑے تو انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ ان میں سے بعض ہدایات یہ ہیں۔

۱۔ گرمیوں میں اگرچہ درجۂ حرارت ۱۰۰ یا اس سے زیادہ ہو تو آدمی پانی کے بغیر دو سے پانچ دن تک زندہ رہ سکتا ہے بشرطیکہ سایہ میں رہے۔ اگر وہ دن کو سایہ میں رہے اور آرام کرے اور رات کو سفر کرے تو ایک سے تین دن تک جی سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس پانی کا کوارٹ ہو تو آدھا دن اور زندہ رہ سکتا ہے۔

۲۔ اگر درجۂ حرارت ۸۰ اور ۱۰۰ کے درمیان ہو تو انسان پانی کے

بغیر پانچ سے نو دن تک زندہ رہ سکتا ہے، بشرطیکہ ہر وقت سائے میں آرام کرے۔ اگر دن کو سایہ میں آرام کرے گا اور رات کو سفر کرے گا تو تین سے سات دن تک زندہ رہے گا۔ اگر اس کے پاس پانی کا پوا ہو تو آدھ دن زیادہ زندہ رہ سکتا ہے۔

سوال سائے کا ہے۔ صحرا میں سو سو میل لمبے ٹکڑے دیکھے گئے ہیں جن میں سائے کا نشان بھی نہیں ہوتا۔

پیاس کی موت سخت تکلیف دہ ہے۔ بلجیم کے ایک مدبر نے جو مرتے مرتے بچا تھا اس نے مجھے بتایا کہ مجھے اتنا یاد ہے کہ میری زبان سوج گئی تھی۔ اور بول نہیں سکتا تھا۔ ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ بچائے جانے کے ہفتوں بعد تک مجھے پیاس رہتی۔ میرا سفر صحرا خطرناک تو ذرا بھی نہ تھا۔ البتہ دلچسپ ضرور تھا۔ سردیوں کی رات تھی۔ دو فرانسیسی سپاہی راہنما تھے ہمارے پاس فوجی گاڑی تھی۔ بڑی مضبوط، بہت کم اونچی، بہت طاقتور، کہ ریت کنکر اور پتھروں پر خرگوش کی طرح بھاگتی چلی جاتی تھی۔ کچا راستہ برا بھی نہیں تھا۔ خاصا کشادہ کہیں کہیں پتھریلا۔

میں نے اسکاٹ لینڈ میں اور ورمنٹ میں اس سے خراب سڑکیں دیکھی ہیں اگرچہ لگاتار تین دن تک سفر نہیں کیا۔ ہم تین دن کی محنت کے بعد سات سو میل سفر طے کر کے تمانرسیت سے الغولی پہنچے۔

پہلا دن تمانرسیہ سے عرک تک

ہم گیارہ گھنٹے تک سفر کرتے رہے۔

راہ میں صرف ایک بس ملی جو صحرا کو طے کر کے فورٹ لیمی سے بحیرۂ روم کے ساحل پر الجزائر جا رہی تھی۔ ہم نے اس بس کو جا لیا یہ پہلے ہی بارہ دن لیٹ تھی کہ راہ میں کئی بار انجن کی خرابی کی وجہ سے ٹھہرنا پڑا تھا۔ جہاں ہم نے بس کو پہلے دیکھا وہاں اونٹوں کے سفید سفید پنجر پڑے تھے جو اس بات پر شاہد تھے کہ ماضی میں کبھی صحرا نے اپنی قربانی وصول کر لی ہے۔

دن بھر کے سفر میں آبادی کا ایک ہی نشان ملا۔ یعنی عربوں کی جھونپڑیاں۔ باقی ۲۳۵ میل تک کوئی پیٹرول پمپ بھی نہ تھا۔ البتہ کنوؤں کے نشانات ضرور تھے۔ جب ہم نے خطِ جدی کو عبور کر لیا تو راہ پر نشانات کے ذریعے اس کی تصدیق ہو گئی۔

ہوگر کے خطے سے گزرتے ہوئے ہم نے عجیب وضع کی پہاڑیاں دیکھیں۔ ہاتھیوں کی طرح چھوٹے ہوئے کدوؤں کی طرح کی بھدیوں کی طرح راستہ پتھروں سے پٹا پڑا تھا اور گاڑی سانپ کی طرح رینگتی چلی جا رہی تھی ہر پانچ چھ منٹ کے بعد ہمارا شوفر رک جاتا اور بندوق اٹھا کر ان ہرنوں کا شکار کرنا چاہتا جو دور نظر آ رہے تھے اور ہر بار کہتا تھا بال بال بچا۔ ایک گولی بھی نشانے پر نہیں لگی۔ صحرا میں موٹروں کے ذریعے سفر ۱۹۲۲ء سے شروع ہوا۔ اس سے پہلے اونٹ چلتے تھے، اور ان دنوں سفر اونٹ کی رفتار سے ناپا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ صحرا سات مہینے چوڑا اور چار مہینے گہرا ہے ہم ایک دن میں عرک پہنچ گئے۔ اونٹ دو تین ہفتوں میں پہنچتے۔

عرک جہاں ہم نے رات گزاری شہر نہیں بلکہ ایک برج یا سرائے ہے۔ یہ صرف اس لئے تعمیر کیا گیا ہے کہ قانون کے مطابق ہر ۲۵۰ میل کے بعد ایک برج ہونا چاہیئے۔ برج میں جو افسر متعین تھا اور جسے ایک دو ہفتے کے بعد کسی یورپین کی شکل نظر آتی تھی اس نے ہمیں رات کا کھانا بہت اچھا دیا۔ البتہ آلوؤں کی کثرت تھی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ صحرا میں پتھروں پر تصویریں کندہ پائی گئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ کبھی نسبتاً ہرا بھرا تھا۔ اور یہاں ایسے وحشی لوگ رہتے تھے جن کا گزارہ شکار پر تھا۔

دوسرا دن عرک سے الفلاح تک

ہم چلے تو نباتات کا نام ونشان مفقود ہو گیا۔ اس سے پہلے کہیں کہیں صحرائی جھاڑیاں نظر آتی تھیں جو بکریوں کا چارا بن سکتی ہیں۔ اب وہ علاقہ تھا کہ پتھروں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ دور سرخ پہاڑوں کے دامن میں سفید ریت کے انبار نظر آتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے برف پڑی ہو۔

دوپہر کے وقت ہم نے کالے پتھروں پر دریاں بچھالیں اور مزے سے کھانے پینے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایک زندہ چیز ہماری تفریح میں شامل ہو گئی یعنی ایک مکھی۔

سہ پہر کے بعد راستہ نسبتاً بہتر ہو گیا۔ پیچ و خم کم ہو گئے اور پر تاثر بھی کم ہو گیا جیسے ہم کسی سو کھے دریا کی تہ پر لگاتار سفر کر رہے

سنگ میل ایک دوسرے کے قریب تر نظر آنے لگے اور صاف بھی - یہاں پیمائش کلومیٹر کے حساب سے ہوتی ہے - دن بھر ہمیں کوئی کار نہ ملی اور نہ کوئی الف ان بی ۱۷ البتہ جب ہم اپنی منزل سے قریب پہنچے بعد عصر عرک کے برج سے ۲۰ میل دور تھے تو تیل نکالنے والے لوگوں کا ایک خیمہ نظر آیا -

انصلاح کا نخلستان کم و بیش حبشیوں کی بستی ہے - آبادی پانچ ہزار ہے جس میں ۴۳ فرانسیسی شامل ہیں - نارنجی رنگ کی عمارتوں پر مٹی کے نقش و نگار اور در و دیوار پر وہی پرانا جالی دار کام نظر آیا - یہ نخلستان تمانرسیت کی طرح جاذب نظر نہیں لیکن بعض لحاظ سے یورپ کی تہذیب سے قریب تر ہے مثلاً بجلی رات کے دس بجے تک جلتی ہے، لیکن سوق اتنا سنسان تھا کہ جی اُلجھنے لگا - مکھیاں بچوں سے یوں چمٹی تھیں جیسے وہ مٹھائی ہیں

اس نخلستان میں ۸۰ ہزار کھجور کے درخت ہیں - مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نخلستان کے متعلق کچھ بیان کیا جائے - عموماً یہ نشیب میں ہوتے ہیں کہ پانی ریت اور پتھروں کے نیچے سے گزر کر کہیں زیر زمین جمع ہو جاتا ہے اگر یہ پانی سطح سے قریب ہو اور کھجور کی جڑیں نمی حاصل کر سکیں تو نخلستان وجود میں آتا ہے لیکن عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ آب پاشی کے لئے بہت سی تدبیریں اختیار کرنی پڑتی ہیں - ایک اچھے نخلستان میں سبزی کی تین سطحیں ہوتی ہیں - اوپر کھجور کے درخت سبزیاں، اور پھول سطح زمین سے بالکل قریب ہوتے ہیں - ہر نخلستان جیل کی طرح ہے - جو پانی یہاں پہنچتا ہے وہ

گویا تنِ صحرا کا خون ہے۔

تیسرا دن الصلاح سے الغولی تک

جب ہم الصلاح سے تیسرے دن کی صبح کو روانہ ہوئے تو جھاڑی کا نام و نشان بھی نظر نہ آتا تھا۔ اب صحرا پیلا نہ رہا بلکہ سیاہ ہو گیا۔ پتھر بھی تابشِ آفتاب سے سنولا گئے ہیں۔ اب ہم تادیمائت کی سطحِ مرتفع تک پہنچے جس کی چڑھائی سیڑھیوں کی طرح ہے۔ چوٹی پر پہنچے تو دور ایک اونٹوں کا کارواں جاتا ہوا نظر آیا، عین اس طرح جس طرح سینما میں دکھایا جاتا ہے۔ یقین نہ آتا تھا کہ یہ سُست رفتار قافلہ واقعی محوِ سفر ہے۔

دوپہر کے وقت ہم فورٹ مری ہل میں ایک تیل کے چشمے کے پاس پہنچے۔ وہاں ہم نے سنگِ میل پر لکھا دیکھا۔ بیدو کنگ ۱۰۹ کیلومیٹر۔ ٹمبکٹو ۲۲۹۲ کیلومیٹر۔ فورٹ سیجے ۳۰۹۰ کیلومیٹر۔

بیدو کنگ فرانسیسی کلمہ ہے یہ تیل کا سٹور ہے اور ان مسافروں کے لئے جو صحرا کا دوسرا راستہ استعمال کرتے ہیں۔ پہلے اور بھی ایسے سٹور تھے لیکن اب جو کاروں کو بار بار تیل بھرنے کی ضرورت پڑتی ہے تو بیدو کنگ باقی رہ گیا ہے۔ ٹمبکٹو داستانوں کا مشہور شہر ہے جو صحرائے اعظم کے جنوبی کنارے پر واقع ہے اور سیاحوں کی جستجو کی غایت رہا ہے۔ سب سے پہلے جو یورپین یہاں پہنچا وہ نوجوان رینے کیلی تھا کہ فرانسیسی نژاد تھا۔ اسی نے سب سے پہلے اس شہر کی حیرت انگیز داستانیں یورپ



والوں کو سنائیں۔ یہ کیلی بچپن ہی میں یتیم ہوگیا تھا اور شروع ہی سے ٹمبکٹو تک پہنچنے کا شائق تھا۔ اس کی آرزو آخر ۱۸۲۸ء میں بر آئی۔ اس سے صدیوں پہلے یہ شہر ایک مشہور دارالسلطنت چلا آتا تھا۔

فورٹ میرابل میں جو لوگ تیل کے چشمے کے سلسلے میں مقیم تھے انہوں نے ہمیں دوپہر کا کھانا کھلایا۔ بعض فرانسیسی جنہیں صحرا سے محبت ہے متوقع ہیں کہ تیل کی جستجو ناکام ثابت ہو گی۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم بیس سال سے باشندوں کو سمجھا رہے ہیں کہ فصل بوؤ، زراعت میں محو ہو جاؤ، زمینداری سے فائدہ اٹھاؤ اور خوش حالی کی زندگی بسر کرو۔ اب یہ تیل کی جستجو کرنے والے لوگ آ پہنچے ہیں ان کی وجہ سے جسے دیکھو وہ ان کی ملازمت کے لئے بھاگا جا رہا ہے ممکن ہے تیل سے صحرا کے لوگ مستفید ہوں، لیکن یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ برباد ہو جائیں۔ فرانسیسیوں سے غلطیاں ضرور ہوتی ہیں، لیکن متعدد فرانسیسی ایسے بھی ہیں جو واقعی اپنے فرائض دیانتداری سے سرانجام دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ افریقہ کے باشندوں کی حالت سدھر جائے۔

جب ہم فورٹ میرابل سے چلے تو سامنے وہ پہاڑی راستہ تھا۔ جو مشرق کے ربع خالی اور مغرب کے ربع خالی کے درمیان پڑتا ہے۔ ان دو سنسان بے آب و گیاہ خطوں کے درمیانی راستے پر سفر کرتے ہوئے انجن میں ریت پڑ گئی اور ہمیں رکنا پڑا۔ شوفر انجن کا نقص دور کر رہا تھا اور میں اپنے تینوں طرف ان درخشاں و تاباں سرابوں کو دیکھ رہا تھا جو چاندی کی طرح چمکتے ہوئے اور پارے کی طرح دمکتے ہوئے، وہ زنگ پھیپے ہوئے تھے اور اپنے کے

خوش گوار ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کھجور کے درخت خوب ہوتے ہیں کہ انہیں سورج کی تپش بھی درکار ہے اور پانی کی کثرت بھی ۔ جب فرانسیسی الغولی آئے تو یہاں صرف ۶۰۰۰ نخل تھے ۔ اب ۱،۰۰،۰۰۰ کے لگ بھگ ہیں ۶۰ درخت ہوں تو ایک خاندان گزر بسر کر سکتا ہے ۔ کھجور کے اکثر باغات ، فرانسیسیوں کی ملکیت ہیں جو کھڑی فصل اس طرح خرید لیتے ہیں جس طرح ہم فلوریڈا میں زمین خریدتے ہیں ۔ البتہ خود یہاں رہتے بہت کم ہیں ۔ یہاں ۱۰۰۰۰ کی آبادی ہیں اکثریت تو عربوں کی ہے کچھ تبو بھی ہیں جو زمینت کہلاتے ہیں ۔

ساتھ ہی ایک بے آب و گیاہ پہاڑ ہے ۔ اس پر سلیٹی رنگ کا ایک قلعہ کھڑا ہے جسے قصر کن کہتے ہیں کہ ۹۰۰ سال پرانا ہے ۔ کسی انجینیئر سے (جو سوئٹزرلینڈ کا رہنے والا تھا) پوچھا گیا کہ سیمنٹ ، کیلوں ، لوہے اور ایسی ہی چیزوں کے بغیر صرف گارے سے ایسا مضبوط قلعہ بنایا جا سکتا ہے ؟ تو اس نے کہا ہرگز نہیں ۔

یہاں میں نے ایک دوپہر رومن کیتھولک مذہب کی ایک جماعت ۔ "وائٹ فادرز" کے ممبروں کے ساتھ بسر کی جس کی بنیاد ۱۸۶۷ء میں رکھی گئی تھی اور جس کا مقصد یہ تھا کہ شمالی افریقہ میں مسلمانوں کو عیسائی بنایا جائے اس جماعت کے ارکان دودھیا سفید چغے پہنتے ہیں اور لمبی داڑھیاں رکھتے ہیں ۔ انہوں نے لوگوں کو لکھانے پڑھانے کا کام بہت کامیابی سے کیا ہے ۔ ان کے ساتھ کی جماعت "وائٹ سسٹرز" نے لڑکیوں کا ایک

مدرسہ جاری کر رکھا ہے - یہ لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کا کام مشکل ہے کم از کم اس خطہ میں تو ہونے سے رہا۔ ایک رگمن نے مجھ سے کہا یہاں کے مسلمان بالکل نہیں جھکتے اور نہ تاریخ کے دباؤ میں آتے ہیں نہ عقل کا کہا مانتے ہیں۔"

شفا خانے کے انچارج ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ دس سال میں اندھی آنت کے متورم ہونے کا یا پھٹ جانے کا کوئی کیس کبھی نہیں ہوا۔ نہ کسی کو سرطان یا کینسر ہوا۔ میں نے دق کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ ابھی تک صحرا اس لعنت سے محفوظ ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ یورپ کے آباد کار یہ بیماری بھی یہاں پھیلا دیں ـــ یا جن خطوں میں دق عام ہے وہاں کے لوگ یہاں آکر اس کا باعث ہوں

اونٹ بھی عجیب جانور ہے۔ باوقار، سست، نشاد اور وضع دار۔ اونٹ کا مالک اپنے جانور سے اس طرح محبت نہیں کرتا جس طرح گھوڑے سے۔ نہ اونٹ ہی گھوڑے کی طرح مالک کو پیار کرتا ہے۔ اونٹ کا مالک اکثر اپنے جانور کا نام بھی نہیں رکھتا اور میں نے کسی سے نہیں سنا کہ اونٹ کسی انسان کو پہچان لیتے ہوں، چاہے وہ مہینوں اس پر سواری کرتا رہا ہو۔

سواری کا اونٹ ۵۰ سے لے کر ۱۰۰ ڈالر تک قیمت پاتا ہے اور بار برداری کا ۶۰ ڈالر کے قریب لیکن اکثر لوگ اونٹ خریدتے نہیں خود پال لیتے ہیں۔ سات سال میں جوان ہوتا ہے اور پندرہ سال کی عمر تک کام دیتا

ہے سواری کا اچھا اونٹ، گلابی یا زردہ سا ہوتا ہے جیسے انڈے کے چھلکے کا رنگ ہوتا ہے ۔

عموماً اونٹ دن میں پندرہ میل سفر کر لیتا ہے لیکن موسم بھی اچھا ہو، اور اونٹ بھی ہو تو بیس میل بلکہ پچیس میل سفر کر لیتا ہے یہ جانور ہمیشہ نرم زمین پر چلتا ہے کہ پتھریلی زمین ہو تو اس کے سم پھٹ جاتے ہیں کیچڑ سے اس کو نفرت ہے بشرطیکہ جو گھاس پھوس چرتا ہے وہ نمناک ہو اور اسے کام نہ کرنا پڑے اگر اس سے کام لیا جائے تو اچھے نمناک چارے کے باوجود پانی کے بغیر، دس بارہ دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا گرمیوں میں تو چارہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، ہر تیسرے دن پانی پلانا پڑتا ہے ۔

عموماً اونٹ کی صحت کا اندازہ اس کے کوہان سے ہو جاتا ہے اگر لمبا سے کام زیادہ لیا جائے یا خوراک کم دی جائے تو کوہان سخت نہیں رہتا اور سکڑ جاتا ہے چارہ اچھا ملے تو پھر اصل حالت پر آ جاتا ہے ۔ بشرطیکہ اونٹ بوڑھا نہ ہو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اونٹ کی بیماری کی مالک کو اطلاع بھی نہیں ہوتی اور ایکا ایکی گر کر مر جاتا ہے

اگر دو تین اونٹ صحرا میں چلتے پھرتے نظر آئیں تو جان لیجئے کہ ایک گشتہ جارہا ہے ۔ جس کاروان کو تجارت کے لئے تیار کرتے ہیں اس میں اکثر ۵۰ یا ۶۰ اونٹ ہوتے ہیں اگرچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ پانچ چھ سو یا پھر ۲۰۰ کے قریب ہوں ۔ جو عرب کاروان کی راہنمائی کرتے ہیں وہ کسی مافوق الانسان کی بدولت سے راستے کا کھوج نکالتے ہیں ۔ کبھی ریت

کے تودے کی شکل ایسی مناظر نشین ہوتی ہے کہ آدھے سے زیادہ کچھ ائیں اڑا کر لے جائیں تو بھی وہ پہچان لیتے ہیں

میں نے پوچھا کہ نوٹوں کی جگہ جیپ سے کب کام لیا جائے گا۔ کہ یہ گاڑی بہت اچھی اور کار آمد ہے جواب ملا کہ کبھی ایسا نہ ہوگا۔ اس نے کہا۔

(۱) پیٹرول پر روپیہ اٹھتا ہے (۲) جیپ بھی مشرقی یا مغرب کے عظیم ربع خالی کو طے نہیں کر سکتی (۳) جیپ مرتی نہیں اور مرے تو اس کے گوشت نہیں ہوتا۔

(۹)

لیبیا، ایک نئی قوم جو ترقی کی راہ پر گامزن ہے

لیبیا، غیر معروف، لیکن دلچسپ ملک ہے۔ امریکنوں کو یہ معلوم بھی ہو کہ کہاں ہے تو اس کی وسعت کا اندازہ نہ ہوگا۔ یہ ملک تمام مغربی یورپ سے بڑا ہے اور امریکہ کا پانچواں حصہ ہوگا۔

یہ بحیرۂ روم کے ساحل پر واقع ہے اور صحرا ایں دُور تک پھیلتا چلا گیا ہے دریا کوئی ہے ہی نہیں اور کچھ نخلستان سے قطع نظر ملک کم و بیش بنجر ہے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ چھاجوں مینہ برستا ہے لیکن تازہ پانی پینے کو صرف نخلستان کے کنوؤں میں ملتا ہے اور بس۔

صحرائے شمال کی جانب ایک ناخوش گوار ہوا چلتی ہے جسے مقامی لوگ غبلی کہتے ہیں اور جس کی نظیر دنیا میں نہ ملے گی۔ یہ ہوا ساحلی شہروں پر بھوری بھوری ریت چھڑک دیتی ہے اور درجۂ حرارت کو ۱۲۰ تک پہنچا دیتی ہے۔

ساحلی شہر طریپولی (طرابلس) سے کچھ میل دور جنوب کی طرف، لیبیا کے صحراؤں، سائے میں بھی درجۂ حرارت ایک سو چونتیس اور ایک سو چھبیس تھا،

دُنیا میں اتنا درجہ حرارت کبھی کسی جگہ (اسائیہ میں) نہیں پایا گیا۔ لیبیا میں اب تک نہ قیمتی معدنیات دستیاب ہوئیں نہ تیل (ممکن ہے مستقبل میں دستیاب ہو جائیں کبھی سعودی عرب کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی اب تیل کی دریافت نے اس ملک کو اتنی ثروت بخشی ہے کہ یقین نہیں آتا)۔ اس ملک کی زمین کا ۱۰ فی صد ہی کاشت کے قابل ہے۔ اس لئے یہ ملک دنیا کے مفلس ترین ممالک میں شمار کیا جاتا ہے۔

پوری آبادی ۱۱۵۰۰۰۰ ہے جو شہر ڈیٹرائٹ سے بھی کم ہے، لیکن ان لوگوں کو بھی پیٹ بھر کے روٹی نہیں ملتی۔ سالانہ آمدنی کی اوسط ۳۵ ڈالر فی کس ہے۔ لیبیا میں کوئی بینک نہیں یہاں کے کسی باشندے کو ڈاکٹر بننے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی ریل کی پٹڑی کا طول ۲۲۵ میل ہے ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں کچھ اصلاحات ہو جائیں کیوں کہ یہ ملک بالکل نیا ہے آزاد مراکش اور تیونس سے اس کی عمر کچھ سال ہی زیادہ ہوگی۔

لیبیا کو آزادی کے لئے جنگ نہیں کرنی پڑی۔ پہلے یہ اطالوی نوآبادی تھا۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء کو اقوامِ متحدہ نے ایک آزاد ملک کی حیثیت سے اسے جنم دیا۔ غلام ملکوں کی آزادی کے سلسلے میں اقوامِ متحدہ نے یہ پہلا قدم اٹھایا تھا۔ نوعمر ملک اپنے سوتیلے ماں باپ کی نگرانی میں چلنا سیکھ رہا ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ بلوغت تک اس کی کیا کیفیت ہوگی۔

افلاس لیبیا کا پیچیدہ ترین مسئلہ ہے۔ لیکن ایسا ہی ایک مسئلہ اور بھی ہے جو اس بات کا ردِ عمل ہے کہ اس ریگستانی ملک کو جو اصل میں تین جداگانہ ملکوں سے

عبارت تھا۔ یو۔ این۔ او نے وحدتِ سیاسی کی صورت دے دی ہے۔ یہ تین ملک یعنی ٹریپولیٹانیا۔ سارانیکا اور فیزآن اپنی مخصوص تاریخ اور پس منظر رکھتے ہیں۔ ان کو اس بات پر ترغیب دلانا کہ واحدہ کی طرح مل کر کام کریں مشکل ہے۔ پہلے دونوں ملک ساحل پر متصلاً واقع ہیں۔ آب و ہوا اور جغرافیائی کیفیت سے قطع نظر باقی ہر چیز میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ دونوں ملکوں میں وسائل رسل بھی بہت کم ہیں اور لوگ ایک دوسرے کو بے اعتمادی اور نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ٹریپولیٹانیا کی رومانوی تاریخ

یہ ملک آٹھ لاکھ انسانوں کی بستی ہے۔ یعنی لیبیا کی آدھی آبادی یہیں رہتی ہے۔ نئی سیاسی وحدت کے مغربی کنارے پر یہ ملک تاریخی کوائف میں تیونس کا شریک ہے کہ یہاں بھی پہلے فینقیہ والے پھر رومی اور پھر وندال حملہ آور ہوئے آخر میں رومی ہی پھر متصرف ہو گئے۔

اس ملک کا سب سے جیالا فرزند رومیوں کے پہلے قبضے کے دنوں میں پیدا ہوا۔ وہ اقوام بربر کا فرد تھا اور اس کی رگوں میں حبشی خون تھا۔ اس جیالے جنگ آزما کا نام سپٹیمن سیورس تھا۔ وہ رومی فوج میں کمانڈر تھا کہ ایک دن یہ اطلاع ملنے پر کہ روم کا شہنشاہ ہلاک کر دیا گیا ہے۔ اس کا انتقام لینے کے لئے روم پہنچا۔ جب قاتلوں کو سزا دی جا چکی تو اسی کو شہنشاہ قرار دیا گیا۔ صرف یہی ایک افریقی ہے جسے یہ مقام حاصل ہوا اور جس نے

اپنے وطن کو یوں سربلند کیا ۔ اُس نے ۱۹۳ء سے ۲۱۱ء تک حکومت کی ۔ کئی بار عراق اور یورپ پہ یورش کی اور لطف یہ کہ یارک میں مرا جو انگلستان میں واقع ہے ۔

رومیوں نے اپنے وقت میں اس ملک کے ساحل پہ ٹریپولیٹانیا یا تین شہروں کا سلسلہ قائم کیا تھا یعنی سبریتھا ، لیپٹس میگنا اور اوہیا ۔ ماہرین آثار قدیمہ نے صدیوں کی ریت کھود کر ان شہروں کے کچھ حصے برآمد کئے ہیں لیپٹس میگنا میں بازار دریافت ہوئے ہیں جن پر پتھروں کا فرش ہے اور جن پر رومی رتھوں کے نشانات اب تک موجود ہیں ۔ سبریتھا کے مقام پر ایک رومی تھیٹر کے سنہری ستون برآمد ہوئے ہیں جو بحیرہ روم کے نیلگوں پردے کے سامنے سورج کی روشنی میں جگ مگ جگ مگ کرتے ہیں ۔

ان تینوں شہروں میں سے آج صرف اوہیا زندہ ہے ۔ اس کا نیا نام ٹریپولی یا طرابلس ہے ۔ ٹریپولی کا مطلب ہے تین شہر ۔ اور پہلے اس کلمہ سے تین شہر ہی مراد تھے ۔ یہ شہر ٹریپولیٹانیا کا دارالحکومت تھا ۔ اور آج اس کا سب سے مشہور شہر ہے ۔ صدیوں تک اس شہر کی تاریخ ہی پورے ملک کی تاریخ رہی

جب عربوں نے آٹھویں صدی میں شمالی افریقہ کو فتح کیا تو طرابلس تجارت کا اہم مرکز بن گیا ۔ اس کے بعد مسلمانوں کے مختلف فرقے اسے فتح کرنے کی کوشش میں ایک دوسرے کے حریف رہے ۔ ایک بار یوں ہوا کہ بظاہر اونٹوں کا قافلہ شہر کے دروازے سے گزر کر اندر پہنچا تو ہر بوری میں سے ایک مسلح آدمی باہر آیا ۔ شہر والے بھونچکا رہ گئے اس طرح دو بغاوت اور خونریزی کئے

بغیر شہر مسخر کر لیا گیا۔

گیارہویں صدی میں عربوں کا دوسرا حملہ ہوا اور مصر کے وحشی قبیلوں نے جو شمالی افریقہ کی غارت گری پر تلے بیٹھے تھے طرابلس پر قبضہ کر لیا لیکن تاخت وتاراج سے احتراز کیا۔ اس لئے شہر کے حسن میں فرق نہ آیا اور تجارتی اہمیت میں بھی کوئی کمی نہ ہوئی۔ چمکتے ہوئے سپید گھر اور ہرے بھرے باغ دیکھ کر سیاح حیران ہوتے تھے۔ حملہ آور شہر کے سوا دوسرے حصوں پر اپنا اقتدار کامل نہ قائم نہ کر سکے اور ہمسایہ حکومتوں پر تو انکا کوئی اثر ہی نہ تھا۔ اس کے بعد صدیوں تک طرابلس کو کمزور ترین ریاست سمجھا گیا۔ مدتوں یہ ملک ترکوں کے زیرنگیں رہا ہے۔

۱۷۱۱ء میں کہ بحری قزاقی زوروں پر تھی، شہر کی تاریخ میں ایک خونی باب کا اضافہ ہوا۔ طرابلس آزاد تو ہو گیا لیکن لوگوں کو آزادی کی نعمتوں سے مستفید ہونے کا موقع نہ ملا۔ ہوا یہ کہ ایک ترکی منصب دار احمد قرامنلی نامی نے ثروت وسلطنت دونوں حاصل کرنے کی ٹھانی۔ اور دونوں حاصل کر کے دم لیا۔ لیکن دھوکے سے۔

پہلے تو سازش کا جال یوں بچھایا کہ ترکی فوج کے تین سو اہم ترین سرداروں کو رات کے کھانے پر بلایا۔ اور غلام گردشوں اور گلیاروں میں جو محل کے بڑے کمروں میں کھلتے تھے، طاقوں اور محرابوں کے قریب وفادار نوکر مقرر کر دیئے۔ وقت پر مہمان آئے تو غلام گردشوں سے گزرے۔ ایک ایک کر کے پکڑے اور مارے گئے اور ترکی سلطنت کا ایک ہی نمائندہ باقی رہ گیا۔ یعنی احمد قرامنلی۔ اس

نے اپنی شاہیت کا اعلان کر دیا اور اپنے آپ کو حامد اعظم کا لقب دیا۔ یہ حاکم ظالم، قاہر اور استبداد پسند تھا۔ اس نے رعایا کا لہو چوس لیا۔ اور بحری قزاقی کو یوں سنبھالا جیسے اس کے خاندان کا خاص پیشہ ہو۔

اس حاکم کے محل کے کھنڈر کہ اس کے خاندان کے لوگ قریباً سو سال تک اس میں رہتے تھے، آج بھی موجود ہیں ان کا رخ سمندر کی طرف ہے جس طرح پرانے وقتوں میں جب حریف قوم کے افراد دیواروں اور فرش سے باندھے جاتے تھے تو اس کے تہ خانے نمناک ہوتے تھے۔ اسی طرح آج بھی یہیں اوپر کے کمروں میں ایک کمرہ (راہنمائی اطلاعات کے مطابق) اخمنی واقعات کا مرکز ہے۔ یہاں قرامنلی کے پڑپوتے نے تخت کی خاطر اپنے بھائی کا خون بہایا تھا۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں ۱۸۱۵ میں طرابلس کو امریکہ کے ساتھ ایک معاہدہ کرنا پڑا کہ بحری قزاقی ختم کر دی جائے گی۔ لیکن اس معاہدے کے بعد بھی دوسرے ملکوں کے جہازوں پر حملہ ہوتا رہا۔ قرامنلی خاندان زیادہ دولت مند ہوتا گیا مگر لوگ اور پستے گئے یہاں تک کہ جب ۱۸۳۵ء میں ترکی نے قرامنلی خاندان کو شکست دے کر ملک کو اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا تو لوگوں نے چین کا سانس لیا۔ اب کے ترکوں نے ملک پر گرفت مضبوط رکھی۔ دوسرے ملکوں کے لوگ ملک میں آ ہی نہیں سکتے تھے کہ جاسوس گنے جاتے تھے۔ اندرون ملک کے بربری دیہات دنیا سے کانلا کٹ گئے۔ زندگی وحشیانہ ہو گئی اور لوگوں کے رسم و رواج بھی وحشیانہ ہو گئے۔ جب کسی آدمی کو قتل کی سزا دی جاتی تھی تو خود قاتل کا لڑکا باپ کو ہلاک

کرتا تھا اور مقتول کے ورثا زرق برق کپڑے پہنے تماشہ دیکھتے تھے اور اس کا خون پی کر جی ٹھنڈا کرتے تھے۔

اب طرابلس کی تجارت گھٹ گئی، شہر قلاش ہوگیا، جہازوں کا آنا جانا بہت کم ہوگیا۔

شہر کی جنگی اہمیت البتہ قائم رہی۔ فرانس، انگلستان اور اطالیہ سب ہی اس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد اطالیہ نے ترکوں کو کمزور ہوتے دیکھ کر طرابلس سے نکال دیا۔

ریت ہی ریت

فزآن، یعنی طرابلس کے جنوب میں صحرائی علاقہ ابھی تک کم و بیش غیر معروف ہے۔ لیبیا کی کل آبادی کا ۲ فیصدی یہاں بستا ہے۔

یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے جب پانچ سو قبل مسیح میں گزرا ہے فزآن اور اس کے بکھرے ہوئے نخلستان کا ذکر کیا تھا۔ ان دنوں یہاں کے لوگ گارا منٹیز کہلاتے تھے۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے اُن کے مویشی عجیب و غریب ہیں۔ مویشی کے سینگ آگے کو جھکے ہوتے ہیں اس کی وجہ سے چرنا اُن کے لئے مشکل ہوتا ہے یہ لوگ ساتھ کے وحشی لوگوں پر جو غاروں میں رہتے ہیں حملہ کرتے ہیں اور انہیں لونڈی غلام بنا لیتے ہیں حملہ کرتے وقت رتھوں میں گھوڑے جوت لیتے ہیں کہ وحشی لوگ حملہ آوروں سے کہیں تیز رفتار ہیں ہیروڈوٹس یہ بھی لکھتا ہے کہ فزآن کے نخلستان اور بحیرۂ روم کے ساحل

کے درمیان کے صحرائی علاقے میں عجیب قسم کے انسان رہتے تھے کسی کا سر سرے سے نہ ہوتا تھا اور کسی کا سر کتّے کی طرح۔

روایات کا بیان ہے کہ جب عرب فاتح یعنی عقبہ شمالی افریقہ کی تسخیر کے لئے نکلا اور فزان سے گزرا تو اس کے گھوڑے نے جہاں پاؤں سے زمین کریدی تھی وہاں سے چشمہ ابلنے لگا۔ آج یہاں گدامس کا شہر آباد ہے۔ یہ بہت قدیم شہر ہے اور تجارتی قافلوں کا مرکز رہا ہے۔

یہاں کے رہنے والے بربر راسخ العقیدہ ادریس مانذہ مسلمان ہیں۔ فزان کے دوسرے نخلستانوں کے باشندے جو ایک دوسرے سے میلوں کے فاصلے پر واقع ہیں یا تو عرب خانہ بدوش ہیں یا وہ ان حبشی غلاموں کی اولاد ہیں جو سوڈان سے لائے گئے تھے۔

سولہویں صدی میں ترکوں نے فزان پر حاکمیت کا اعلان کیا لیکن یہ علاقہ اتنا دور افتادہ ہے کہ اس پر کبھی حملہ ہوا ہی نہیں۔ اس کی تاریخ یہ ہے کہ یہ ملک طرابلس کے ماتحت شمار کیا جاتا رہا ہے حالانکہ اس ملک کے ساتھ طرابلس کا رابطہ صرف اونٹوں کے ذریعے قائم رہا ہے اور آج بھی یہی صورت ہے دارالحکومت صبحہ میں پچاس ہزار نفوس آباد ہیں لیکن یہ شہر بھی بالکل الگ تھلگ اور دور افتادہ ہے موٹریں اور ہوائی جہاز یہاں آئیں بھی تو طرابلس سے نہیں، تیونس سے آتے ہیں یہ شہر لیبیا میں واقع ہے لیکن لیبیا کے کسی حصے سے اس کا رابطہ بآسانی قائم نہیں ہوتا کہ نہ کوئی اچھی سڑک ہے نہ ہوائی سروس۔

سائرینائیکا اور سنوسی

اس ملک کی تاریخ باقی تمام ملکوں سے مختلف ہے مثلاً رومی سلطنت کا جزو یہ کبھی بنا ہی نہیں یہاں یونانی ضرور آئے تھے۔ ۶۰۰ ق م سے ۲۰۰ بعد از مسیح تک (دبارہ سو سال) یہ ملک یونانیوں کے زیر اثر رہا۔

یونانیوں نے جو شہر بسائے تھے اُن میں سے ایک سائرین تھا اور ایک بیرنیس۔ پہلے شہر پر ملک کا نام ہے دوسرے کو اب بنغازی کہتے ہیں اور یہی دارالسلطنت ہے دنیا میں زہرہ کے جو حسین ترین مجسمے ہیں ان میں سے ایک سائرین سے نکلا ہے

پرانے وقتوں میں سائرین بہت باثروت شہر تھا کہ یہاں ایک پودا سلفیم سطح مرتفع کی ڈھلوانوں پر بڑی کثرت سے اُگتا تھا یونانیوں کے خیال میں یہ ہر مرض کا علاج تھا۔ مثلاً بچھو کا کاٹا، کتے کا کاٹا، اور ذیابطیس کا مریض اس سے اچھا ہو جاتا تھا۔ شراب، زعفران، کالی مرچ، سرکہ اور چوہے کی مینگنیاں ملا کر اس بوٹی سے پھوڑوں کا علاج بھی کرتے تھے۔ اس بوٹی کی بدولت شہر کو اتنی ثروت حاصل ہوئی کہ اُس نے اپنے سکے ڈھالے حالانکہ کارتھیج والوں نے بھی اُس وقت ایسا نہیں کیا تھا۔

جب سکندر اعظم نے چوتھی صدی قبل مسیح میں بحیرۂ روم کے ساحل کے مشرقی علاقے فتح کرنیکے بعد مصر میں سکندریہ کا شہر آباد کیا تو سائرینیکا کے یونانی باشندوں کو معلوم ہوا کہ وہ سکندریہ کی وسیع مقبوضات میں آباد ہیں اس کے بعد طبعاً جب کوئی فساد پڑتی تو یہ لوگ مصر سے مدد مانگتے۔ علاوہ ازیں

جن علماء نے سکندریہ کو شہرتِ دوام بخشی ہے ان میں سے کچھ سارانیکا ہی کے رہنے والے تھے۔

سکندریہ کے کتب خانے کا صدر مہتمم اراتسینھنز، جو پرانے وقتوں کے ممتاز ترین سائنس دانوں میں سے تھا سارینی میں پیدا ہوا۔ ۲ ہزار سال کی بات ہے جب لوگ دنیا کو چپٹا سمجھتے تھے اس نے ستاروں اور سورج کے سائے کا مطالعہ کر کے یہ بات ثابت کی کہ زمین گول ہے اور یہ بھی کہ بہت جسیم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب اس نے تحقیقات مکمل کی تو اتنے صحیح نتائج کر سکے ہیں اگر لوگ اس سائنسداں کے نظریات قبول کر لیتے تو آج دنیا کی تاریخ مختلف ہوتی۔

آٹھویں صدی میں سارانیکا عالمِ اسلام کا جزو بن گیا۔ تین سو سال بعد مصر کے عربوں نے اس پر حملہ کیا۔ سولھویں صدی میں یہ ترکوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۲ء میں ترکی اور اطالیہ کی جنگ چھڑ گئی۔

اندریں اثنا عربوں کی ایک ایسی جماعت صحرا میں پنپ رہی تھی جس کے ارکان شعلہ خو، مذہبی معاملات میں سخت گیر، اور بڑے متقی تھے۔ یہ لوگ سنوسی کہلاتے تھے۔ سنوسیوں کی جماعت نے جو اصلاح کا بیڑا اٹھا کر نکلی تھی اور حبِ وطن کو جزوِ ایمان سمجھتی تھی اس ملک کی تاریخ اور تعمیر میں بڑا حصہ لیا ہے

اس جماعت کا بانی، جو سنوسیِ اعظم کہلاتا تھا ۱۷۸۷ء میں الجزائر میں پیدا ہوا۔ وہ بدوی تھا لیکن اعلیٰ درجے کا عالم اور صوفی تھا۔ پہلے وہ الجزائر

کام کرنا چاہتا تھا لیکن جب فرانسیسی ملک پر قابض ہو گئے تو اس نے سائرین کے قریب ۱۸۴۳ء میں اپنی جماعت کی خانقاہ تعمیر کی۔ اب ملک کے مختلف حصوں میں، نخلستانوں اور گاؤں میں، زاویے قائم ہو گئے۔ (زاویہ کی جمع یعنی ذکر و فکر کا مقام) ان زاویوں کے مہتمم مدرسے بھی چلاتے تھے اور شہری نظم و نسق میں بھی مدد دیتے تھے۔

۱۸۵۹ء میں سنوسی اعظم کی وفات ہوئی تو اس کے دونوں بیٹے مصروف کار رہے۔ کفرہ کے نخلستان میں ایک یونیورسٹی قائم کی۔ ہر زاویئے کا مہتمم اس کے مصارف کے لئے ایک مخصوص رقم بھیجتا تھا۔ فارغ التحصیل طلبا کو بدویوں کے ہاں جاکر تبلیغ کا فریضہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ ان لوگوں نے اس طرح جی لگا کر کام کیا کہ آج سائرینیکا کی نوے فیصدی آبادی سنوسی کی معتقد ہے ۱۹۱۱ء تک یہ جماعت پُرامن رہی۔ ترکی نائب السلطنت اس جماعت کی طاقت سے فائدہ اٹھا کر مختلف مقامی زاویوں کی مدد سے ملک کے بکھرے ہوئے عربوں کو مٹھی میں رکھتا تھا۔ لیکن جب اطالیہ نے ملک پر حملہ کیا تو سنوسی وطن کی مدافعت میں جان پر کھیل گئے۔

لیبیا ایک اطالوی نوآبادی

افریقہ کی لوٹ کھسوٹ میں اطالیہ ذرا دیر سے شامل ہوا۔ اس لئے اسے چنداں فائدہ نہ ہوا۔ فرانسیسی جہاں پاؤں جما کے بیٹھ گئے تھے وہاں اطالیہ کو جانے کی ہمت نہ تھی۔ مصر پر انگلستان متصرف تھا تو اطالیہ یہی کر سکتا تھا کہ ترکی کو شکست دے کر لیبیا کی تین ریاستوں پر قابض ہو جائے

چنانچہ نہایت بے رحمانہ کشت و خون شروع ہوا۔

فزان اور ٹریپولیٹانیا پر تو اطالیہ کا قبضہ جلدی ہو گیا اور سارانیکا کا حاکم بھی شکست کھا گیا۔ لیکن لوگ بالخصوص سنوسی مخالفت پر تلے رہے سنوسیوں سے ۱۹۱۱ء میں جھڑپیں شروع ہوئیں اور ۱۹۱۷ء تک خون ریز لڑائیاں جاری رہیں۔ پہلی جنگِ عظیم میں سنوسیوں نے اپنے سابق فرمانرواؤں یعنی ترکوں سے مل کر اطالیہ کا مقابلہ شروع کیا۔ صلح ہوئی لیکن قائم نہ رہ سکی۔ ۱۹۲۲ء میں لڑائی ٹھن گئی اور آخر ۱۹۳۲ء میں اطالیہ کو فتح ہوئی۔

عمر المختار ایک شجاع سنوسی راہنما کفرہ کے نخلستان میں آخر دم تک اطالیہ سے لڑتا رہا۔ جب اسے گرفتار کیا گیا تو وہ زخموں سے سر رہا تھا لیکن اطالوی حکومت نے اسے بیس ہزار لوگوں کے سامنے پھانسی دی۔ لوگوں کو مجبور کیا گیا تھا کہ وہ تماشا دیکھیں۔ سنوسیوں کی بسالت اور حبِ وطن کا اندازہ اس سے ہوگا کہ جب تک ان کے بالغ مردوں کے دو تہائی افراد کٹ نہیں گئے انہوں نے ہتھیار نہیں ڈالے۔

اطالیہ تو انکار کرتا ہے لیکن یہ کہانی مشہور بہت ہے کہ اطالوی اپنے دشمنوں کو ڈرانے کے لئے کسی مقامی شیخِ قبیلہ کو پکڑ کر ہوائی جہاز میں بٹھا لے جاتے تھے، اس کے گلے میں تختی لکھ کر لٹکا دیتے تھے کہ وہ کون ہے اور پھر زندہ اس گاؤں میں پھینک دیتے تھے جسے ڈرانا مقصود ہوتا تھا۔

اطالیہ نے یہ کیا کہ اپنی ضروریات سے زائد آبادی کو لیبیا بھیج دیا کہ

دباؤ کم ہو جائے۔ لوگوں کو بہت ترغیب دی گئی۔ لیکن صرف بانوے ہزار اطالوی لیبیا میں آباد ہوئے۔

اطالیہ نے لیبیا میں متعدد شاندار دفتر بنائے۔ پبلک عمارتیں اور سڑکیں تعمیر کیں، لیکن لوگوں کی تعلیم اور صحت کی طرف سے غفلت برتی۔ حکومت خود اختیاری کی تربیت بھی نہیں دی گئی۔ فرانسیسیوں کے طرزِ عمل کے برخلاف اطالیہ نے یہ بھی نہ کیا کہ عربوں کو مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتا۔ اطالوی دور میں شہری حقوق بھی پامال کر دیئے گئے بینی ٹو مسولینی جو ۱۹۲۲ء میں اطالیہ کا فاشسٹ آمر بن بیٹھا تھا عربوں کے دل ہاتھ میں لینا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے خارجہ حکمت عملی میں کچھ تبدیلی کر دی۔ وہ چاہتا تھا کہ افریقہ کے لوگ کسی حد تک خوش حال ہو جائیں اور زندگی کا معیار بڑھ جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسولینی کے زمانے میں لیبیا کا معیارِ زندگی بہ نسبت آج کل کے معیار سے بلند تھا چنانچہ شہروں میں رہنے والے بہت سے عرب اطالیہ کے حلیف بن گئے۔ لیکن سنوسی اس ماحول سے غیر متاثر رہے۔ وہ اسی طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر وطن کی مدافعت کرتے رہے۔ اطالیہ سے ان کی دوسری لڑائی مسولینی ہی کے زمانے میں ہوئی۔

لیبیا ایک نیا آزاد ملک جب ۱۹۴۳ء میں امریکہ اور اتحادیوں نے اطالیہ کو شکست دی تو لیبیا خود بخود ہاتھ سے نکل گیا۔ لیکن جب لڑائی ختم ہوئی تو فاتحین طے نہ کر پائے کہ

لیبیا کے متعلق کیا حکمتِ عملی اختیار کی جائے۔ ان دنوں فرانس عارضی طور پر فزان پر قابض تھا (فرانسیسی فوجوں نے بڑی بے جگری سے صحرا کو عبور کر کے اعلیٰ درجے کی جنگی تدبیروں سے کام لے کر اس علاقے کو مسخر کیا تھا) برطانیہ باقی حصہ پر متصرف تھا۔ اقوامِ متحدہ کے ارکان یہ سوچ رہے تھے کہ لیبیا کا مستقبل کیا ہوگا۔

امریکی وفد نے تجویز پیش کی کہ دس سال تک اس ملک پر اقوامِ متحدہ کا اقتدار قائم رہے۔ اس کے بعد معاملے پر پھر غور کیا جائے یہ بڑی اچھی تجویز تھی لیکن بوجوہ منظور نہ ہو سکی۔ اس کے بعد روسیوں نے کہا کہ ہم ٹریپولیٹانیا پر بطور امین متصرف ہوں گے۔ اس تجویز نے سب کو چونکا دیا پھر لیبیا کی تقسیم کی تجویز پیش ہوئی کہ فرانس فزان پر، برطانیہ سائرینیکا پر اور اطالوی ٹریپولیٹانیا پر قابض ہو۔ لیکن اکثر ارکان کو یہ بات ناگوار ہوئی کہ شکست خوردہ اطالیہ کو لیبیا کا کچھ حصہ دلوایا جائے۔

آخر لوگ بحث سے اکتا گئے۔ ملک کا مستقبل غیر معمولی اور نامعقول جلد بازی سے کام لیکر طے کر دیا گیا اور ۱۹۵۰ء میں اقوامِ متحدہ نے اعلان کیا کہ ۲۱ دسمبر ۱۹۵۱ء سے پہلے لیبیا آزاد ہو جائیگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک سال کے اندر حکومت کی مشینری کو موثر بنانا پڑے گا اور یہ ناممکن تھا۔ مثال کے طور پر سارے ملک میں صرف سترہ باشندوں نے کسی یونیورسٹی سے کوئی ڈگری لی تھی لیکن حکومت کا قیام بھی اب ناگزیر تھا۔

خوش قسمتی سے جو برطانوی منصب دار لیبیا پر حکومت کرتے رہے تھے

انہوں نے لیبیا کی حکومت کے ماتحت کام کرنا منظور کر لیا۔ لیبیا کے باشندوں نے اور کئی دوسری قوموں کے نیک نیت لوگوں نے مل جل کر کام کیا۔ سب نے محسوس کیا کہ اس خطے میں آئینی بادشاہت موزوں رہیگی اس عہدے کے لئے مناسب آدمی بھی موجود تھا یعنی سنوسی جماعت کے موسس کا پوتہ۔

شاہ معظم فرمانروائے لیبیا

لیبیا کے بادشاہ کا پورا نام السیّد محمد ادریس المہدی السنوسی ہے عموماً اسے شاہ ادریس اوّل کہہ کر پکارتے ہیں۔

نیا فرمانروا سوچ بچار کرنے کا عادی ہے اور ہر ایک کو شبے کی نظر سے دیکھتا ہے وہ بڑا منتقی اور خاصا بوڑھا ہے۔ ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوا تھا اس کے کردار میں شرافت اور وضع داری ہے۔ ساتھ ہی وہ طبیعت دار بھی ہے اور اس کا ایمان ہے کہ لیبیا کو آزاد رہنا چاہیئے وہ کوئی مغربی زبان نہیں جانتا لیکن عربی کا دقیق النظر عالم ہے۔ عالم اسلام میں ایسا ذہین دفریس اور فاضل حکمران شاید ہی کوئی ہوگا۔ اس میں نقص یہ ہے کہ متذبذب ہے اور ذوق عمل سے محروم۔

جب میں نے اسے قاہرہ میں دیکھا تو وہ حال ہی میں بیماری سے اٹھا تھا وہ صوفے کے وسط میں بیٹھا تھا اور میں کچھ دور کرسی پر۔ اس کی مونچھیں کچھڑی دار ہیں اور سونے کی کمانی دار عینک لگاتا ہے۔ اس نے نیلی قبا کندھوں پر ڈال رکھی تھی اور سر پر وہ مخصوص ٹوپی تھی جسے ترلوش کہتے ہیں اسے دیکھ کر

ہی یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ نہایت رقیق الطبع ہے۔ مشہور ہے کہ عام عرب فرمانرواؤں کی نسبت وہ بہت کم سخن ہے اس لئے جب وہ بے تکلفانہ باتیں کرنے لگا تو مجھے خوشی بھی ہوئی اور تعجب بھی کہ اس کے کلام میں ظرافت بھی تھی اور ذہنی بھی، وہ جسمانی طور پر کمزور ضرور ہے لیکن اسکا ذہن دم شمشیر کی طرح تیز ہے۔ وہ مراکش، امریکہ اور اپنے وطن کی باتیں کرتا رہا ابھی تیونس اور مراکش آزاد نہ ہوئے تھے۔ اس نے مسکرا کر کہا کہ روس کی غلامی کے شکنجے میں جو ملک جکڑے ہوئے ہیں امریکہ ان کی آزادی کے لئے تو بڑی کوشش کر رہا ہے لیکن مراکش اور تیونس کی امریکہ کو پروا نہیں جو آزاد ہو کر ہمیشہ اس کے دوست رہیں گے۔

مسلمانوں کی جانی بوجھی وضع زیست کے مطابق ادریس پہلے مذہبی راہنما ہیں جنکو ۱۹۱۷ء میں سنوسی جماعت کا قائد چنا گیا اور پھر وہ سیاسیات کی طرف متوجہ ہوا۔ کچھ عرصہ وہ سارانیکا کا امیر بھی کہلایا۔ اطالیہ نے بھی اس کا حق امارت تسلیم کیا، لیکن آخر اختلاف ہوا اور اسے مصر میں ۲۱ سال جلاوطنی کی زندگی بسر کرنی پڑی۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس نے برطانیہ کی بہت مدد کی۔ ۱۹۴۳ء میں وہ اپنے وطن لوٹا۔ ۱۹۴۹ء میں اسے سارانیکا کا امیر بنا دیا گیا کہ اقوام متحدہ کے فیصلے کا انتظار تھا۔ پھر ملک کے نمائندوں نے مجلس ملی میں ایک قرارداد کے ذریعے اسے شاہ لیبیا تسلیم کر لیا۔

ادریس کا بیٹا کوئی نہیں۔ اس نے اپنے بھائی رضا کو ولی عہد مقرر کیا ہے جو خوش باش بھی ہے اور لوگوں سے ملتا جلتا بھی ہے کہ شاہی خاندان

کے صرف دو رکن رضا اور ادریس کی پردہ نشین بیوی فاطمہ ہیں اور سارا شاہی خاندان جلا وطن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۵۴ء میں ایسا حادثہ پیش آیا جو ہر مشرقی دربار میں کم و بیش آتا ہے۔

ہوا یہ کہ اُس سال اکتوبر میں امورِ قصرِ شاہی کے وزیر کو ادریس کے ایک بھتیجے نے ہلاک کر دیا۔ سب جانتے تھے کہ شاہی خاندان کے اکثر رکن جن میں ۲۸ شہزادے تھے، مقتول کی حکمتِ عملی کے مخالف تھے۔ لیکن ادریس یہ برداشت نہ کر سکا کہ اسی کے خاندان کا کوئی رکن اسی کے وزیر کو ہلاک کر دے، چنانچہ اس نے اپنے بھائی کے سوا تمام شہزادوں کو وسطِ صحرا کے ایک نخلستان میں بند کر دیا کہ عبرت ہو۔ قاتل کو جو ۱۹ سال کا نوجوان تھا پھانسی دے دی گئی اگرچہ اس کی رگوں میں شاہی خون تھا۔

لیبیا کا اصل مسئلہ وہ اختلافِ رائے ہے جو ملک کے مختلف حصّوں خصوصاً طرابلس اور سارانیکا میں پایا جاتا ہے۔ طرابلس کے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ادریس معمولی سا شیخِ قبیلہ تھا اور اسے ہم پر مسلّط کر دیا گیا ہے۔ وہ اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ملک کے ایک حصّے کے مفاد کو دوسرے حصوں کے مفاد کے مقابلے میں زیادہ عزیز رکھتا ہے مثلاً سینٹ نے اور ایوانِ نمائندگان نے طرابلس میں اجلاس کرنا منظور کر لیا لیکن ادریس وہاں نہیں رہتا، بلکہ رضا نائب بادشاہ کی حیثیت سے رہتا ہے وہ یا تو بیشتر بن غازی میں اپنے محل میں رہتا ہے یا سارانیکا کے پہاڑی علاقوں میں اپنے گرمائی صدر مقام میں۔

یہ درست معلوم ہوتا ہے کہ ادریس کو طرابلس کی نسبت بن غازی زیادہ عزیز ہے اگرچہ دونوں شہر دارالحکومت ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ لیبیا ابھی تک ایک سیاسی وحدت میں تبدیل نہیں ہوا۔

دُنیا کی سیاست میں لیبیا کا مقام

۱۹۵۳ء میں لیبیا نے مصر اور اپنے مشرقی ہمسایوں کا حلیف بن کر عرب لیگ میں شرکت کر لی ۔ یہ وہی بلاک ہے جو ہر جگہ قوم پرست عربوں کی تائید و حمایت کرتا ہے ۔ مصر جو اس تحریک کا قائد ہے لیبیا اور دوسری عرب ریاستوں سے گہرے روابط قائم کرنے کا متمنی ہے ۔

لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ عرب لیگ کی پالیسی بالخصوص کرنل ناصر کے عروج اور اعلان آمریت کے بعد اور اکتوبر ۱۹۵۶ء کے بحران سیاسی کے بعد (نہر سویز کا قضیہ) مغربی طاقتوں کے خلاف اور روس کے حق میں ہو گئی ہے لیبیا والے عرب ہیں لیکن وہ عرب لیگ کے اس رجحان سے ناخوش ہیں ۔ کیونکہ وہ برطانیہ اور امریکہ سے اچھے تعلقات رکھنا چاہتے ہیں ۔ لیبیا کو روپے کی اور ماہرین علم و فن کی ضرورت ہے یہ بات اس کی خارجہ پالیسی کا سنگِ بنیاد ہے ۔ میں نے ایک بوڑھے منصب دار سے بات چیت کی ۔ وہ بولا "پیٹ میں روٹی ہو اور دماغ میں علم کی روشنی تو ٹھیک ہے اور یہی ہم چاہتے ہیں"۔ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ جو وہ چاہتے ہیں وہ چیز انہیں مصر سے نہیں مغرب سے ملے گی ۔ کم از کم زیادہ امکانات یہی ہیں ۔ پھر وہ اشتراکیت کے مخالف ہیں اور



بساطِ سیاست پر کسی کا مہرہ نہیں بننا چاہتے۔

لیبیا نے امریکہ اور برطانیہ سے جو معاہدے کیے ہیں ان کی رُو سے برطانیہ لیبیا کو مالی مدد دیتا ہے اور ملک میں فوجیں متعین رکھتا ہے۔ امریکہ ملک میں اپنا ہوائی اڈہ قائم رکھتا ہے (وی لیس فیلڈ) پھر امریکہ لیبیا کو مالی مدد بھی دے رہا ہے اور ماہرینِ فن بھی مہیا کر رہا ہے۔ وی لیس فیلڈ اصطلاحاً اڈا نہیں صرف میدان ہے۔ یہاں امریکہ کے فوجی ہوائی جہاز دنیا کا چکر لگاتے ہوئے اترتے ہیں اور چاندماری بھی ہوتی ہے۔ افریقہ کے دور دراز اندرونی علاقوں میں بھی ہمیں ایسے علاقوں کی ضرورت ہے پہلے تو امریکہ نے وی لیس فیلڈ کے لئے ۴۰۰ مختلف آدمیوں سے زمین کرایہ پر لی تھی لیکن ۱۹۵۴ء کے معاہدے کی رُو سے امریکہ پابند ہے کہ بیس سال میں لیبیا کو پینتالیس ملین ڈالر دے۔ اس کے علاوہ اور مالی مدد بھی دی جائے گی اور اس کے بدلے میں وہ وی لیس فیلڈ پر متصرف رہے گا۔

لیبیا کا مستقبل

امریکی مشیروں اور اقوامِ متحدہ کے ماہرین نے بالعمل کہ لیبیا کو ایک مدرسہ بنا دیا ہے۔ وہ تمام آبادی کو بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلیم دے رہے ہیں اور ملک کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا یا چلنا سکھا رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی اسراف بھی ہوا ہوگا

لیکن پھر بھی فائدہ یقیناً لیبیا ہی کو پہنچا ہے۔ امریکہ اور اقوامِ متحدہ کے منصوبے کے چار اہم پہلو ہیں ۱۔ صحتِ عامہ ۲۔ طبعی ذرائع دولت ۳۔ زراعت ۴۔ تعلیم۔ مختلف ملکوں سے ماہرین علم و فن آکر مختلف شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔ مثلاً ٹیکس، دباغت، جنگلات کی نگہداشت، نخلستان کی پرورش اور حفاظت، بچوں کی نفسیات کا مطالعہ اور جسمانی تربیت۔

صحتِ عامہ کے سلسلے میں سب سے پریشان کن بیماری آنکھوں کے لگ رہے ہیں کہ لیبیا کے بچوں کو نوّے فیصد یہ شکایت ہوتی ہے۔ یہ بیماری مکھیوں سے پھیلتی ہے۔ لوگوں کو ڈی ڈی ٹی کا استعمال سکھایا جا رہا ہے۔ اس مرض پر قابو پا لیا گیا تو اندھاپن بھی دور ہو جائیگا جہاں تک قدرتی ذرائع، دولت اور زراعت کا تعلق ہے کوشش یہ ہے کہ خوراک کی پیداوار بڑھائی جائے۔ ۱۹۵۲ء میں امریکہ نے بڑی تعداد میں گندم بھیجی تھی کہ خشک سالی کی وجہ سے قحط کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ فزان میں عام لوگوں کو روزانہ آدھے پیٹ بھی کھانے کو نہیں ملتا اور یہ بھی اُن دنوں کہ مینہ خوب برسے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں لوگ ہر وقت بھوکے رہتے ہیں۔ یہ مشکل دُور رَس منصوبوں سے حل ہو گی۔ امریکی ماہر صحرا کا جائزہ لے رہے ہیں۔ زیرِ زمین پانی کے نقشے بنا رہے ہیں اور فصلوں کو بہتر بنانے کی دُھن میں لگے ہیں تعلیم پر بہت سی باتوں کا مدار ہے۔ اگرچہ ابھی تک کسانوں کو یہ بات

سمجھائی نہیں جا سکی کہ زراعت کے نئے طریقے سیکھنے چاہئیں۔

لیبیا میں ایک قسم کی گھاس ہوتی ہے جس سے بہت اعلیٰ درجے کا کاغذ بنتا ہے۔ لیبیا کی پیداوار میں اسے امتیاز حاصل ہے۔ اس کی مقدار بڑھانے کی کوشش جاری ہے۔ اون بھی بہتر پیدا کرنے کی کوشش جاری ہے۔ مثلاً بھیڑوں کے مالکوں کو سکھایا جا رہا ہے کہ وہ لید کے چھوٹے چھوٹے ذرّے صاف کر دیا کریں جن کی وجہ سے اون اچھی قیمت نہیں پاتی۔ چنانچہ اب قیمت بڑھ گئی ہے۔ ہزاروں تخمی درخت لگائے جا رہے ہیں اور ایک منصوبہ بڑے طمطراق سے بنایا گیا ہے جسے منصوبہ استمرار تودہ ہائے ریگ کہتے ہیں خیال ہے کہ اس منصوبے کی تکمیل سے ملک میں قابل کاشت زمین بڑھ جائیگی۔

امریکی ماہرین کو ایک بات نے بہت پریشان کیا ہے اور وہ ہے گدھوں کی مقبولیت۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس جانور کی لید جلانے کے کام آتی ہے۔ پانی کا کنواں چلانے میں بھی ان سے مدد ملتی ہے لیکن اس کے سوا ان کا اور کیا فائدہ ہے۔ نہ دودھ دیں نہ ان کا گوشت کھایا جاسکے۔ نہ ان کی کھال سے چمڑا بنے نہ بالوں سے اون، نہ اونٹ کی طرح بار برداری کے کام آئیں۔ یہ ماہرین چاہتے ہیں کہ گدھے کی جگہ اونٹ کو استعمال کیا جائے لیکن مشکل یہ ہے کہ لیبیا والے گدھوں سے جدا ہونے پر راضی نہیں ہوتے۔

اب تعلیم کی کہانی سنیئے۔ یہ ملک بھی شمالی افریقہ کے ہر سنئے ملک کی طرح تعلیم کا پیاسا ہے۔

اقوامِ متحدہ کے ایک افسر نے مجھے بتایا کہ یہاں علم کی پیاس ایسی ہے،

جیسے کوئی ریت میں سے پانی نکالنا چاہے۔ جب ملک آزاد ہوا اس وقت آبادی کا دسواں حصہ پڑھ لکھ سکتا تھا۔ لیکن اب جبری تعلیم کے منصوبے بنائے جا چکے ہیں۔ امریکہ اور اقوامِ متحدہ کی مدد سے پروگرام کی تمام شقیں عملی جامہ پہن رہی ہیں

نخلستان میں جو مدرسے ہیں، ان میں دن میں تین بار پڑھائی ہوتی ہے بعض جماعتیں خود اپنے اسکول قائم کرنا چاہتی ہیں کہ حکومت کا انتظار نہ کرنا پڑے لیکن ملک مفلس ہے، اس لئے سکولوں میں سامان کی کمی ہے۔

بلیک بورڈ تو ایک طرف، پنسل بھی کمیاب اور مہنگی ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی روایات کی وجہ سے عورتوں کو تعلیم دینا مشکل ہے۔ لڑکیاں مدرسوں میں کم جاتی ہیں۔ لڑکوں کے مقابلے میں اسکولوں میں ان کی تعداد ایک فیصد ہے۔ یہ درست ہے کہ امید افزا صورتیں بھی نظر آ رہی ہیں۔ دنیائے جدید کی ہوا چل رہی ہے۔ بن غازی میں ایک خوشحال گھرانے کی مسلمان لڑکی نے کہ سولہ سال کی تھی صاف کہدیا کہ میں گھر چھوڑ کر پڑھنے کے لئے جا رہی ہوں مجھے اس بات پر شرم آتی ہے کہ تمام مدرّس شام یا مصر سے درآمد کئے جاتے ہیں۔ ابھی تک یہاں استادوں کی تعلیم کی ضرورت ہے پھر پیشہ وروں کو بھی تعلیم دینی چاہیئے۔ مثلاً نجاروں کو۔

امریکہ کے محکمۂ اطلاعات نے اچھا کام کیا ہے کہ اکثر امریکی موضوعات پر فلمیں پیش کرتا ہے جو اتنی مقبول ہیں کہ دن میں کئی کئی بار دکھائی جاتی ہیں جو لوگ پڑھ سکتے ہیں وہ ہر قسم کی کتابیں پڑھ لیتے ہیں اور اتنی کتابیں یہاں موجود ہیں کہ سب لوگ پڑھ سکتے ہیں۔ اگر واشنگٹن یہاں لائبریریاں قائم کرنے

پر روپیہ صرف کرے تو بڑا فائدہ ہوگا۔

امریکی افسروں نے تمام ملک میں، کلبوں میں، مدرسوں میں اور دوسرے اداروں میں ریڈیو رکھ دیئے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔

دو دارالحکومت۔ طرابلس اور بن غازی

اگرچہ لیبیا قلاش ہے، لیکن طرابلس جس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے بڑا خوبصورت، صاف ستھرا اور جاذب نظر شہر ہے۔ عمارتیں اطالوی فن تعمیر کا بہت اچھا نمونہ ہیں اور اس سلسلے میں اطالیہ کا بہت روپیہ اٹھا ہے۔ سڑکیں بھی کشادہ ہیں اور دونوں طرف پٹڑیاں سایہ دار درختوں سے گھری ہوئی ہیں۔ طرابلس کا ماضی کسی نہ کسی رنگ میں دکھائی دے جاتا ہے کہیں پانچ سو سال پرانی ترکی فرمانرواؤں کی بنائی ہوئی دیواریں ہیں اور کہیں رومیوں کے وقتوں کے ستونوں میں طرابلس کا ماضی صاف جھلکتا ہے۔ ابھی تک طرابلس میں وہ قلعہ سب سے خوبصورت اور باوقار عمارت ہے جس میں قرامنلی خاندان کے ارکان رہتے تھے۔ سامنے قرامنلی کی مسجد ہے جس کے سفید مینار اور گنبد روشنی میں جگمگاتے ہیں۔ یہیں اسی خاندان کے ارکان دفن ہیں۔ سنگ لحد بڑے خوبصورت اور دودھیا سپید ہیں۔ سنگ لحد اور تعویذ دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سنگ مرمر کے ستونوں پر سپید سنگ مرمر کے عمامے رکھے ہوں۔ ایک سیاح کا کہنا ہے کہ یہ سنگِ لحد سنگ بستہ شلغموں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ طرابلس کا وہ حصہ بھی صاف ستھرا ہے جہاں عرب رہتے ہیں لیکن بازار

دوسرے شہروں کے بازاروں کی طرح بارونق اور جاذب نظر نہیں یہاں سونے کے گلوبند بہت اچھے بنتے ہیں۔ ان میں زنجیروں کا ایک سلسلہ دونوں طرف پھیلا نظر آتا ہے اور اس سے عورت کے گلے سے لیکر اس کی کمر تک ڈھک جاتی ہے۔ زنجیروں سے پالڑیوں سے سونے کے ہاتھ یا مچھلیاں لٹکتی ہیں۔ ہاتھ، جناب فاطمہ زہرأؑ کے دست اقدس کی علامت اور مچھلیاں نیک بختی کا تعویذ سمجھی جاتی ہیں۔

عورتیں ایک خاص لباس پہنتی ہیں اور اس کی وضع قطع یہ ہوتی ہے کہ قبا کو کمبل کی طرح اپنے بدن اور سر کے گرد لپیٹ لیتی ہیں۔ لوگوں کے ہجوم میں منہ بھی ڈھانپ لیا جاتا ہے۔ بایئں آنکھ البتہ بے نقاب رہتی ہے۔

امریکیوں کے نقطۂ نظر سے یہاں کا قابل دید مقام پروٹسٹنٹوں کا وہ قبرستان ہے جہاں پانچ امریکی ملاّح دفن ہیں۔ یہ ایک امریکی جہاز انٹرپیڈ کے عملے میں شامل تھے کہ قزاقوں کے ساتھ بحری لڑائی میں جہاز ڈوب گیا امریکی فوجیں ۱۸۰۴ء میں اپریل کی ۲۷ تاریخ کو طرابلس کے نزدیک اتریں اور اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔ اس کے بعد صرف ۱۹۴۳ء میں امریکی سپاہی دوسری جنگ عظیم کے سلسلے میں یہاں اترے۔

ہوائی جہاز سے دیکھیئے تو طرابلس نخلستان معلوم ہوتا ہے اس کے کنارے اتنے صاف ہیں جیسے کسی نے سبز اور سپید شکل کو چاقو کے ذریعے اردگرد کی ریت سے کاٹ کر علیحدہ کر دیا ہو۔ چھوٹے نخلستان بھی ہوائی جہاز سے نظر آتے ہیں اور بربروں کے گاؤں بھی جو پہاڑیوں میں واقع ہیں اور مچھیروں کے

دیہات بھی دکھائی دے جاتے ہیں جو اطالیہ کی تعمیر کردہ ساحلی شاہراہ پر واقع ہیں۔ تجارتی ہوائی جہاز شمالی افریقہ میں بہت کم اُڑتے نظر آتے ہیں لیبیا اور دوسرے ممالک بلکہ تیونس اور طرابلس کے درمیان بھی ہوائی رابطہ قریباً مفقود ہے۔ کسی ہفتہ جہاز اُڑتا ہے کوئی ہفتہ خالی گزر جاتا ہے۔ حال ہی میں ایک برطانوی تجارتی کمپنی نے ہوائی سروس شروع کرنے کا اعلان مُشتہر کیا ہے اور اونٹوں بکریوں، گھوڑوں اور بھیڑوں، گائے بھینسوں کے نقل و حمل پر خاص مراعات دینے کا وعدہ کیا ہے۔

لیبیا میں متعیّن امریکی سفیر کی مہربانی سے مجھے طرابلس سے بن غازی تک فوجی ہوائی جہاز میں اڑنے کا موقعہ ملا۔ ہم شام کے قریب منزل پر پہنچے اور خلا میں چکر کاٹتے رہے تاکہ مٹی کے تیل کی جو مشعلیں موجود تھیں انہیں روشن کیا جائے کہ اترنے کی جگہ صاف نظر آئے کیونکہ وہاں روشنی کا اور کوئی انتظام تھا ہی نہیں۔

بن غازی بہت ہی تباہ حال شہر ہے ایسا کہ افریقہ میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں بمباروں نے اسے تباہ کر دیا تھا اور دس سال گذر جانے کے بعد بھی اب تک مزدوروں کے دستے ملبہ اٹھا رہے تھے لڑائی کے دنوں میں جو ملبہ اور ایسی دوسری چیزیں جمع ہو گئی تھیں انکا اٹھانا بڑے نفع کا کام تھا۔ سچ پوچھئے تو لوگ اپنے کھنڈروں ہی پر گذارہ کرتے تھے۔

بن غازی طرابلس سے لاکھوں میل دور معلوم ہوتا ہے حالانکہ ہوائی جہاز

تین گھنٹوں میں پہنچتا ہے یہ شہر یورپ کا نہیں بلکہ اس افریقہ کا جزو ہے جس کے فرسودہ چہرے پر قدامت کی جھریاں پڑی ہیں۔ یہاں بدوی اپنے اونٹ لے کر بڑے بڑے بازاروں کے آس پاس خیمہ زن ہو جاتے ہیں آبادی ساٹھ ہزار ہے۔ کوئی بیس ہزار پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ ایک مقامی اخبار چھ ہزار بکتا ہے اور لیبیا کے اعتبار سے یہ بہت اچھی اشاعت ہے۔

یہاں عرب طرابلس کی نسبت زیادہ تند مزاج ہیں۔ قومی لباس پہنتے ہیں۔ ان کی بیویاں کسی خاص یا عام تقریب میں شامل نہیں ہوتیں۔ سنسنی پیدا کرنا مقصود ہو تو کھانے پر کسی عرب سے یہ پوچھیے کہ عورتوں کو پردہ کرنا چاہیے یا نہیں۔ وہ فوراً تاؤ میں آجائے گا۔

بن غازی سے کچھ فاصلے پر کلانسکیو کا دریائے ریگ ہے جسے عبور کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس سے آگے کفرہ ہے۔

یہ کبھی نخلستان گمشدہ کے نام سے مشہور تھا۔ ۱۸۸۱ء تک یہاں کوئی یورپین نہیں پہنچا۔ ۱۸۸۱ء میں ایک جرمن یہاں آیا، لیکن اس کے بعد بھی بہت کم یورپین یہاں پہنچے۔ کفرہ سے بن غازی جیپ سے دس دن کا اور اونٹ سے چالیس دن کا راستہ ہے۔ لیکن وہاں دیکھنے کی کوئی چیز نہیں۔ بیس ہزار مربع میل میں ۲۲ لہ لوگ آباد ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ لیبیا کے سیاسی اور اقتصادی مسائل بڑے الجھے ہوئے ہیں۔ اگر اس کے مختلف علاقوں میں اتحاد پیدا نہ ہوا اور بیرونی امداد نہ ملتی رہی تو ملک کی بدھیا بیٹھ جائے گی لیکن اگر مناسب خوراک

اور اچھی تعلیم میسر آگئی تو ملک ترقی کریگا جسطرح بچے اچھی خوراک پا کر بڑی جلد اس نشو و نما پاتے ہیں۔

ابھی تک لیبیا کے سوتیلے ماں باپ اس کی ترقی پر کچھ زیادہ روپیہ خرچ نہیں کر رہے ہیں۔ شاید وہ یہ بھول رہے ہیں کہ اگر یہ ملک اشتراکیوں کے ہتھے چڑھ گیا یا یہاں لوائف الملوکی پھیل گئی تو مغربی طاقتوں کو بڑا روپیہ خرچ کرنا پڑیگا کیونکہ قلاش اور جاہل ملکوں کی گھات میں دشمن ہمیشہ لگے رہتے ہیں۔ ایک انتشار اور دوسرا اشتراکیت۔

(۱۰)

خلاصۂ کلام

اب ہم شمالی افریقہ کے چاروں ملکوں سے متعارف ہو چکے ہیں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے بھانت بھانت کی بولیاں بولی ہیں۔ او قیانوس سے نیل کنارے قاہرہ اور بحیرہ روم سے صحرائے بے آب وگیاہ تک ہم نے ہوائی جہازوں میں اڑان کی ہے۔ علاوہ ازیں ہم وقت کی فضا میں بھی پرواز کرتے رہے ہیں۔ کانہ پتھ کے معماروں، یعنی فنیقہ والوں سے ملے ہیں اور ان سے پہلے کی اقوام بربر سے بھی۔ جو آج سے پہلے بھی یہاں چلا پھرا کرتے تھے ہم نے مراکش اور تیونس کی بھی سیر کی ہے جو اقوام متحدہ کے نئے آزاد رکن ہیں۔

مختصر یہ کہ کچھ لوگوں کے خیال میں مراکش خیالوں کی وہ جنت ہے جس کی انسان جستجو کرتا ہے، لیکن یہ جنت خوبصورت اور دور افتادہ ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد وحشت خیز بھی ہے، یہاں کوہسار اطلس کی ڈھلانوں پہ اور بنجر صحرا میں جو لوگ رہتے ہیں۔ گذشتہ صدیوں میں ان کا رہن سہن بہت کم بدلا ہے۔ ان کے دقیانوسی قوانین اور ضوابط حیات انہیں

بالکل الگ تھلگ رکھتے ہیں۔ لیکن شہروں میں اور دیہات میں (بشرطیکہ بہت دُور افتادہ نہ ہوں) ترقی کا خمیر سا اٹھا ہے۔ مراکش بھی نئے سرے جنم لے رہا ہے بہت سی مشکلات کو عبور کر کے جدید ریاست بننے کی کوشش کر رہا ہے مراکش اس بات کی علامت ہے کہ قدیم جاگیردارانہ نظام کے شکنجے میں جکڑا ہوا افریقہ ڈرامائی طور پر نئی دنیا میں شامل ہو گیا ہے۔

تیونس بھی اس بات کی علامت ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ، کہ یہ ملک افریقہ اور ایشیا کے مابین جو کشمکش جاری ہے اس کا معیاری نمونہ ہے اب وہ ملک جو یورپین طاقتوں کے ماتحت تھے آزاد ہو رہے ہیں۔ نوآبادیاں نئے ملکوں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ اس ارتقاء کا عمل اور اس کا رخ امریکہ کے لئے بہت اہم ہے۔ امریکہ اور روس میں جو عصابی جنگ جاری ہے۔ اس کی وجہ سے دنیا دو جماعتوں میں بٹ گئی ہے۔ امریکہ کا مفاد اس میں ہے کہ نئے ملکوں کو دوست بنائے رکھے۔ دنیائے عرب ہماری دوستی کی طالب ہے اور مختلف سیاسی اور اقتصادی مسائل میں رہنمائی کے لئے اسکی نگاہیں ہماری طرف اٹھ رہی ہیں۔

الجزائر میں فرانسی اور عرب قوم پرست برسرپیکار ہیں انجام کی پیش گوئی مشکل ہے۔ جنگ کے علاوہ بھی الجزائر کا ملک ہمارے لئے جاذب توجہ ہے۔ اس وقت وہاں سیاسی اضطراب ہے۔ تباہ کن خانہ جنگی ہے لیکن پھر بھی یہ ملک صحرا کے رموز و اسرار اور اس کے تمکنت و وقار کا حامل ہے یہ صحرائے اعظم آج کل تضادات کی آماجگاہ ہے کہ شمالی افریقہ میں ہر جگہ

یہی صورت ہے، صحرا کے توارغ اپنے دبلے پتلے اونٹ لئے تیل نکالنے والوں کے دوش بدوش زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ تیل نکالنے والے جدید ترین مشینری سے کام لیتے ہیں۔ افریقہ میں اس وقت جدید و قدیم اور امروز و فردا کی پیہم آمیزش نظر آتی ہے۔

لیبیا گویا ایک صندوق ریگ ہے۔ لیکن ریگ کے نیچے خزائن بھی ہو سکتے ہیں۔ لیبیا کے لوگ ملک کی ترقی میں کوشاں ہیں اور امریکی مفاد ان سے تعاون کا مقتضی ہے۔

ہم نے دنیا کے ایک حیرت انگیز حصّہ کا تعارف کرایا ہے لیکن کبھی خود جا کر دیکھئے، شمالی افریقہ کے لوگوں سے خود ملئے اور وہاں کے عجیب و غریب مناظر و مظاہر اپنی آنکھوں سے دیکھئے تو پورا لطف آئے گا کتابیں پڑھنے کی اور بات ہے۔ خود جا کر دیکھنے کی اور بات ہے ع

شُنیدہ کے بود مانند دیدہ

چودھری افضل حق

آبِ رفتہ

اردو زبان و ادب کا وہ کونسا قاری ہے جس نے چودھری افضل حق صاحب کی تخلیق "زندگی" کا مطالعہ نہیں کیا، چودھری صاحب ادب کی راہوں پر چلتے چلتے اکثر اس جگہ جا پہنچتے ہیں جہاں ان کا مقام ایک مفکر اور ایک فلسفی کا مقام معلوم ہوتا ہے سیاست کے صحرا میں بھی وہ ایک ادیب اور فلسفی ہی کی حیثیت سے چلتے رہے۔ اپنی سیاسی زندگی کے بیس برس تک وہ انگریزوں کے خلاف اصولاً و عملاً بغاوت کرتے رہے۔ جرم آزادی کی پاداش میں انہیں بار بار قید خانے جانا پڑا جہاں انہیں تعزیرات ہند کی سخت سے سخت دفعات کے تحت سنگین سے سنگین سزا کا سامنا کرنا پڑا۔

ان کے قومی خلوص، ان کی جدوجہد کے باوجود آج بھی ہمیں ان کے بعض نظریات و افعال سے اختلاف ہے، پھر بھی ان کی تحریریں اس قابل ضرور ہیں کہ انہیں یکجا کر کے شائع کیا جائے تاکہ مستقبل کے مورخ کو ایسے مسلمان مفکروں اور سیاستدانوں کے نقطہ نظر سے شناسائی رہے جو ہمارے نظریات و افعال سے اختلاف رکھنے کے باوجود مخلص یقیناً تھے۔ مرتبہ: جانباز مرزا

قیمت:- ۳/۵۰ روپے

کلاسیک ۴۲ - دی مال لاہور ۳

مؤسسۂ فرینکلن کی چند مطبوعات

مذہب، اسلامیات، تعلیم، سائنس، فلسفہ، تاریخ

مؤسسۂ مطبوعات فرینکلن غیر تجارتی ادارہ ہے۔ اس کا کام خود کتابیں چھاپنا اور فروخت کرنا نہیں۔ البتہ یہ ادارہ اچھی انگریزی کتابوں کے اُردو تراجم شائع کرنے میں پاکستانی ناشرین کی مدد ضرور کرتا ہے۔ یہ اشتہار اور فروخت کا انتظام بھی صرف معاون ناشرین کی حوصلہ افزائی اور فائدے کے لیے ہے کیونکہ اس طرح شائقینِ کتب کو یہ سہولت ایک ہی مرکز سے ہمارے سب معاون ناشروں کی کتابیں مل جاتی ہیں۔ اس فروخت کی پوری آمدنی آخر کار متعلقہ ناشروں ہی کو منتقل کر دی جاتی ہے۔

خدا ہمارے ساتھ ہے

تصنیف: اے۔ کریسی ماریسن

ترجمہ: مولانا صلاح الدین احمد

مشہور مغربی فلسفی جولیس ہکسلے نے ایک کتاب لکھی تھی "انسان بالکل تنہا ہے"۔ یہ کتاب ہکسلے کی اس کتاب کا جواب ہے۔ ایک فلسفی نے دوسرے فلسفی کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ سائنس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ خدائے بزرگ و برتر نے قدرت کی نشانیوں میں اپنا راستہ تلاش کرے۔ ۱/۲۵

خدا موجود ہے

(دوسرا ایڈیشن)

تدوین: جان کلوور مونسما

ترجمہ: عبدالحمید صدیقی

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں: مادہ پرستوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اثبات اسلام، مسیحیت اور یہودیت کے درمیان مشترکہ دلچسپی کی چیز ہے اور اس خدمت کو خواہ کوئی مسلمان انجام دے یا عیسائی یا یہودی وہ ہم سب کی قدر کا مستحق ہے۔

وجود باری تعالیٰ پر چالیس سائنسدانوں کے چالیس خیال افروز مقالات ۔ ۶/۰۰

اسلام اور قانون جنگ وصلح

تصنیف: مجید خدوری

ترجمہ: مولانا غلام رسول مہر

عراق کے مسیحی محقق ڈاکٹر مجید خدوری نے اسلام اور اس کے قانون جنگ وصلح پر اہل مغرب کے بعض الزامات کی پُر زور تردید کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے شریعت اسلامیہ کے بارے میں صحیح معلومات کا قابل قدر سامان فراہم کیا ہے ۔ اپنے موضوع پر یہ دُنیا بھر میں غالباً پہلی کتاب ہے ۔ اس جدید تحقیقی کارنامے سے غور وفکر کی نئی راہیں سامنے آگئی ہیں۔

جزیہ اور اسلام

تصنیف: ڈینیل سی ڈینٹ

ترجمہ: مولانا غلام رسول مہر

یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں تاریخی دستاویزوں کو پیش نظر رکھ کر ابتدائی دور اسلام کے اقتصادی نظام پر بحث کی گئی ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے آغاز میں مفتوحین سے کیا سلوک کیا ہے تاریخوں کے وسیع ذخیرے میں بکھری ہوئی معلومات کو حسین ترتیب سے جمع کرنے میں اس کتاب نے بلند معیار قائم کر دیا ہے ۔ ۱۰/۰

عرب دنیا

تصنیف: محمد عزالدین
ترجمہ: ڈاکٹر محمود حسین

زمانے نے پلٹا کھایا، حالات بدل گئے اور عربوں کو برتری کا وہ بلند ترین درجہ حاصل نہ رہا۔ تاہم آج بھی وہ ان خطوں پر قابض ہیں جنھیں دنیا کی بری، بحری اور فضائی شاہراہوں میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کون ہے جو امن عالم یا کسی منصوبے میں انھیں نظرانداز کرسکتا ہے یا ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے میں بے نیاز رہ سکتا ہے؟ ۱۲/-

بچے کی تعلیم میں گھر اور مدرسے کا تعاون

(دوسرا ایڈیشن)

تصنیف: میری اور لارنس کے فرینک۔ ترجمہ: خان فضل محمد خاں

بچہ گھر کی چار دیواری سے نکل کر تعلیم کی مشکلوں سے دوچار ہوتا ہے تو پریشان ہوتا ہے اس کے ساتھ والدین بھی پریشان ہوتے ہیں۔ اس ضخیم کتاب کے مطالعے سے والدین کو معلوم ہوگا کہ بچے کی ذہنی نشوونما کس طرح ہوتی ہے وہ تعلیم کس طرح حاصل کرتا ہے اور مدرسہ کے اساتذہ اور والدین کا آپس میں ملنا جلنا کتنا ضروری ہے؟ ۹/-

تعلیم کے مقاصد

(دوسرا ایڈیشن)

تصنیف: وائٹ ہیڈ
ترجمہ: ڈاکٹر سید عبداللہ

اس کتاب کا مرکزی خیال یہ عربی مقولہ ہے "اے خدا ایسے علم سے بچانا جو نفع بخش نہ ہو"۔ تعلیم کا پہلا مقصد علم کو عملی زندگی کے لیے مفید بنانا ہے دوسرا مقصد ہے تہذیب نفس۔ مصنف نے تفصیل سے بحث کی ہے اور مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کلاسکی ادب، ادبیات اور ریاضی کی تعلیم کی اہمیت بتائی ہے۔ ۶/۵۰

مؤسسۂ مطبوعات فرینکلن — لاہور

آزاد تعلیم بعد سمر ہل

(دوسرا ایڈیشن)

تصنیف : ہیرالڈ ٹیلر

ترجمہ : سید محمد عظیم

سستی، پیشہ ورانہ اور سائنسی نظامِ تعلیم کے اس دور میں امریکا کی ایک معروف یونیورسٹی کے صدر اس تعلیم کے علمبردار ہیں جو انسان کی مکمل شخصیت کی نشوونما اور ترقی کا ذریعہ بنتی ہے اور جس کی طرف موجودہ معاشرے میں بڑی بے اعتنائی برتی جا رہی ہے۔ آزاد علوم اور آزاد ذہن کے ساتھ ساتھ آزاد تعلیم کے حق میں چند پُر اثر مقالات کا مجموعہ جو پہلے "آزاد تعلیم اور جمہوری تہذیب" کے نام سے چھپ کر ختم ہو چکی ہے۔

جوہری توانائی اور اس کا مستقبل

تصنیف : مارگریٹ او ہائیمر

ترجمہ : پروفیسر محمد احمد خاں

جوہری توانائی کمیشن پاکستان کے سابق صدر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں اب تک صرف امریکا، کینیڈا اور انگلستان میں جوہری توانائی کے سود مند مصرف کی طرف توجہ کی گئی ہے۔ اس کتاب میں جوہری توانائی کے متعلق ضروری معلومات آسان زبان میں پیش کی گئی ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب ہمارے ملک کے مختلف مقامات میں بھی جوہری توانائی کے عمل لے نصب کیے جائیں گے۔

۲/۵۰

چند عظیم علمائے جراثیم

تصنیف : ڈاکٹر پال ڈی کروف

ترجمہ : عبدالمجید قریشی

اس ضخیم کتاب میں دنیا کے گیارہ عظیم علمائے جراثیم کی عجیب و غریب داستانیں ہیں۔ جو غریب تھے، علمی اسناد بھی نہ رکھتے تھے اس کے باوجود انھوں نے خناق، طاعون، ملیریا، سگ گزیدگی، زرد بخار وغیرہ جیسی خوفناک بیماریوں کے جراثیم کو پکڑنے کی دریافت کر کے انسانیت پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

۱۰/-

مؤسسۂ مطبوعات فرینکلن ○ لاہور

جڑی بوٹیوں سے علاج

تصنیف ۔ بی سینٹ ای سلیم

ترجمہ: حکیم حبیب اشعر دہلوی

دُنیا بھر کی جڑی بوٹیوں کی مختصر تاریخ، اُن کے کیمیائی خواص اور طریق علاج۔ طب کی تاریخ بنانے والے مفید پودوں کا حال، ان پودوں کی نشان دہی جو زہریلے بھی ہو سکتے ہیں۔ آج کی پیٹنٹ ادویہ، گولیوں، کیپسولوں میں استعمال ہونے والی جڑی بوٹیوں کے کیمیائی اجزا کے کوائف۔

۲/۵۰

تمہارا جسم کیونکر کام کرتا ہے

تصنیف: ہرمن و نینا شنائیڈر

ترجمہ: خلیق ابراہیم خلیق

دُنیا کی کوئی مشین ایسی نہیں جو دیکھ سکتی ہو یا سُن سکتی ہو، کوئی مشین سونگھ سکتی ہے نہ چکھ سکتی ہے اور نہ محسوس کر سکتی ہے۔ مشینیں نہ تو ہنس سکتی ہیں نہ رو سکتی ہیں نہ خفا ہو سکتی ہیں اور خود بخود بڑھ بھی نہیں سکتیں۔ آپ کے جسم سے زیادہ مکمل اور حیرت انگیز کوئی مشین دُنیا کے کارخانے میں موجود نہیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ اور کسی مشین کے حالات نہیں ہو سکتے۔

۲/۵۰

قوتِ حافظہ

تصنیف: ڈونلڈ اے لیرڈ

ترجمہ: عبدالحمید صدیقی

کیا آپ حافظے کی کمزوری کے باعث پریشان ہیں؟ کیا نام، چہرے اور اہم نکتے آپ کے ذہن سے عین اس وقت نکل جاتے ہیں جب آپ کو ان کی خاص ضرورت ہوتی ہے؟ کیا آپ اعداد، فہرستیں، تاریخیں، کاروباری تفصیلات اور ہر قسم کی معلومات یاد رکھنے کی صلاحیت بڑھانا چاہتے ہیں؟ اس کتاب میں اس کے لیے ایسے چار گُر بتائے گئے ہیں۔ جن پر آپ آسانی سے عمل کر سکتے ہیں۔

۵/-

کیا سائنس ہمیں بچا سکتی ہے

مصنف: جارج لنڈبرگ

ترجمہ: کپتان عبدالواحد

ہاں بچا سکتی ہے۔ لیکن ہمارے معاشرتی مسائل طبعی سائنس حل نہیں کر سکتی۔ مشینیں سرمائے اور محنت کی کشمکش کو نہیں سلجھا سکتیں۔ بجلی کے قمقمے ہمارے دلوں کا اندھیرا دور نہیں کر سکتے۔ ہمارے معاشرتی مسائل کا حل فلسفے، عمرانیات، فنونِ لطیفہ، ادب اور اخلاق میں پوشیدہ ہے۔ یہ ممکن حل اس کتاب میں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے

1/75

داستانِ فلسفہ

دو جلدوں میں۔ (دوسرا ایڈیشن)

تصنیف: ول ڈیوراں

ترجمہ: سید عابد علی عابد

دنیا کے سولہ عظیم فلاسفہ — افلاطون، ارسطو، بیکن، سپائی نوزا، والٹیئر، روسو، کانٹ، شوپنہار، سپنسر، نطشے، برگساں، کروچے، برٹرنڈ رسل، جارج سنتیانا، ولیم جیمز اور جان ڈیوی کے فلسفیانہ افکار کی توضیح و تنقید اور ان کی شخصی زندگی کی رنگین و شگفتہ داستان۔

فی جلد -/8

ناقابلِ تسخیر ذہنِ انسانی

تصنیف: گلبرٹ ہائیٹ

ترجمہ: محمد صفدر

خیر و شر، ظلمت و نور، نشیب و فراز کی مختلف منزلیں طے کرتے ہوئے انسان کا ذہن کن مرحلوں سے گزرا۔ صداقت کی جستجو میں انسان نے کیا سوچا، جہالت کے خوفناک غاروں سے انسان کس طرح بچ کر نکلا۔ گھپ اندھیرے سے رفتہ رفتہ نکل کر تہذیب کے روشن کھلے میدانوں میں کس طرح آیا؟ یہ کتاب انسانی ذہن کی انہی کاوشوں کی داستان ہے۔

2/50

—— مؤسسہ مطبوعات فرینکلن ۰ لاہور ——

ایک نئے ناول نویس کا پہلا ناول

دود چراغ محفل

لمحات کا سنگین ، تکلیف دہ تسلسل ۔ وقت کی اکتا دینے والی گردش ۔ نہ جانے اس گردش میں کتنے کارواں لٹے ہیں ۔ اور کتنے آنسو وقت کی اس بے حسی پر ٹپکے ہیں ۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا ۔ اس کی لامحدود وسعتوں میں نہ جانے کتنی کہانیاں اُبھر اُبھر کر ڈوبیں ، کتنے فسانوں نے جنم لیا اور کتنے نغمے ھونٹوں پر مچل مچل کر سوئے ۔ کون جانے کہ وقت کی ان چیرہ دستیوں کی کتنی داستانیں ، لہو کے سمندروں میں غرق ھو گئیں ۔

دود چراغ محفل

اس شہلا کی داستان ھے ۔ جس کا دل ذرا ذرا سے احساس سے لرز اٹھتا تھا ، جس نے اپنی روح کو غیر ملکی استبداد سے محفوظ کر کے بغاوت کی اور ایسی خوفناک بغاوت کہ اس کے شعلوں میں لارنس اور اس کا بیٹا ڈکنس ھی نہیں ، بلکہ ان کا اپنا خاندان بھی بھسم ھو کر رہ گیا ۔

نوجوان ناول نویس

ذکاء الرحمن

کا پہلا ناول

شاعرانہ نثر کا اعلیٰ نمونہ

خوبصورت کتابت

دیدہ زیب طباعت

سہ رنگا سر ورق

نوروز پرنٹنگ پریس ۔ اردو بازار ۔ لاہور